39 بڑے آدمی

ڈیل کارنیگی

انتالیس 39 بڑے آدمی

ڈیل کارنیگی

ترجمہ: جاوید شاہین

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : انتالیس بڑے آدمی

مصنف : ڈیل کارنیگی

پبلشرز : فکشن ہاؤس

18-مزنگ روڈ، لاہور

فون:7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : اکرم پرنٹرز، لاہور

سرورق : عباس

اشاعت : 2010ء

قیمت : Rs.200/- روپے

FICTION HOUSE
18-Muzang Road Lahore
7249218

ہیڈ آفس 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور

124-ٹیمپل روڈ لاہور

فون:042-7321040

سب آفس حیدرآباد

52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدرآباد

فون:022-2780608

فہرست

تعارف	اسلم کھوکھر	5
1- جارج برنارڈشاء		9
2- جنرل جیمز ڈولٹل		15
3- مادام کیوری		20
4- جنرل جارج سی مارشل		25
5- مارک ٹوین		31
6- جنرل چارلس و نگیٹ		38
7- جیک ڈیمپسی		43
8- ونسٹن چرچل		49
9- ایلی کلبرٹ سن		53
10- جوزف سٹالن		59
11- کلارک گیبل		64
12- جنرل کلیئر چینالٹ		70
13- گلین ایل مارٹن		75
14- لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن		81
15- باب ہوپ		86
16- کیپٹن ایڈی ریکن بیکر		91
17- جون بیری مور		96
18- آلیور وینڈل ہومز		102

19-	جان کرچن سمٹس	108
20-	برنارڈ بارچ	114
21-	جنرل اومر بریڈلے	119
22-	ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز	124
23-	مادام چیانگ کائی شیک	129
24-	جنرل مارک کلارک	134
25-	جنرل ڈوائٹ آئزن ہاور	140
26-	لوول جیکسن تھامس	146
27-	کیپٹن ایڈورڈ ایلس برگ	151
28-	اروِنگ برلن	156
29-	جنرل ڈگلس میکارتھر	161
30-	ڈورتھی ڈکس	166
31-	مسولینی	171
32-	بنگ کراس بے	175
33-	فیلڈ مارشل برنارڈ مونٹ گمری	179
34-	الفرڈ ای سمتھ	184
35-	لارڈ بیور بروک	190
36-	جنرل چارلس ڈیگال	193
37-	کارڈل ہل	198
38-	ہنری جے کیسر	203
39-	رائٹ برادران	208

تعارف

ڈیل کارنیگی 24 نومبر 1888ء کو امریکہ میں میری ول منوری کے مقام پر پیدا ہوا۔ کون کہتا ہے کہ وہ 1955ء کو انتقال کر گیا۔ یہ درست ہے کہ اس کا انتقال ہو گیا مگر وہ لاکھوں، کروڑوں نہیں بلکہ اربوں قارئین کے دلوں میں اپنی بے مثال تحریروں کی صورت میں زندہ ہے۔ اس کی ابدی زندگی اور شہرت دوام کا اندازہ اسی بات سے لگا لیں کہ کارنیگی نے جن اداروں سے فیض اکتساب کیا ان اداروں کی عزت و توقیر میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ تشنگان علم اس کی مادر علمی کے درودیوار کو دیکھنا بھی قابل فخر گردانتے ہیں۔ کارنیگی نے سٹیٹ ٹیچرز کالج وارنزبرگ میں 1904ء سے لے کر 1908ء تک، امریکن اکادمی ڈرامیٹک نیویارک میں 1911ء اور کولمبیا یونیورسٹی سکول آف جرنلزم میں 1913ء اور نیویارک یونیورسٹی جرنلزم سے 1914ء میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے لازوال شہرت کی حامل کتابیں تصنیف کیں۔ ایسی کتابیں تصنیف کرنے کا خواب تو ہر لکھاری دیکھتا ہے مگر ایسی تعبیر کارنیگی جیسے افراد کو ہی ملتی ہے۔ کارنیگی نے صرف اپنی کتابیں ہی نہیں لکھیں بلکہ قائل و متاثر کرنے کے طریقوں پر نیز گفتگو اور تقریر کے فن سے روشناس کرانے والے ادارے بھی چلائے جہاں پر ایسے فنون اور علوم پر عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ کارنیگی امریکہ کے ستر اخباروں میں مخصوص موضوعات پر کالم بھی لکھا کرتا تھا۔ اس کی تمام کتب کے انگریزی سے اقوام عالم کی تقریباً تمام زبانوں میں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

یہ بات بغیر کسی شک و شبہے کی جا سکتی ہے بلکہ اس کی تصدیق تو چہاردانگ عالم سے ہو چکی ہے جس سے کسی کو ذرہ بھر بھی تشکیک نہیں ہے کہ کارنیگی فن تقریر اور شخصیت سازی کا بانی ہے۔ وہ ابتداء سے اب تک شہرت کے سب سے اونچے مینار پر کھڑا ہے اور اسی مینار کی بنیاد اس بات پر استوار ہوئی کہ انتہائی مشکل اور کٹھن دور اور حالات میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوا جا سکتا ہے۔ اس کی کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ جب اس کی کتاب "How to win Friends and Influence People" 1936ء میں شائع ہوئی تو اس کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ بین الاقوامی زبانوں کے

تراجم کی اشاعت کے اعداد و شمار اس میں شامل نہیں۔

اس کی کتابوں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی کتابوں میں کامیابی و کامرانی کے راز تجربات کے ذریعے افشاں کرتا تھا۔ نیز وہ ان کتابوں میں خاکے اور اشکال اور امثال کی مدد سے قارئین کو الجھنوں اور دیگر جھنجھٹوں سے نجات دلاتا۔ اس کا انداز نگارش سادہ، سہل، دل نشین اور عام روزہ کے مطابق ہوتا۔ اس کی تحریر جادو سے مرصع ہوتی وہ جادو یہ تھا کہ اس کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی جائے اور مسائل کے گرداب و بھنور میں ڈولتی ہوئی ناؤ کو منجدھار سے نکال کر کامیابیوں کے ساحلوں تک پہنچایا جائے۔ اس کی باتوں، تحریروں، انداز گفتار اور کتب میں اتنی اثر پذیری کا راز یہ تھا کہ وہ دل سے بات کرتا تھا اور وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ اس اثر انگیزی سے سحرانگیزی کے چشمے پھوٹتے ہیں جو علم و عمل کے پیاسوں کی تشنگی کو بجھاتے ہیں۔

کارنیگی کی تحریروں اور تقریروں کا مرکز و محور یہ رہا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ یقین اور اعتماد کی ڈور کو اپنے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دو پھر آپ کی خواہشات کی پتنگ نیلگوں آسمان کی بلندیوں کو چھو کر رہے گی۔ وہ انسانوں سے محبت کرنے کا درس دیتا ہے اور وہ اپنے قاری کو اپنے گر اور فن سے آگاہ کرتا ہے جس سے وہ لوگ جو دوسروں کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں اور ان کے گرد حقارت کا ہالہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے وہ انہیں دوسروں کے دلوں کو اپنا مسکن بنانے اور انہیں وہاں پر ہمیشہ کے لئے مکین ہو جانے کی تراکیب سکھاتا ہے۔ اپنے قرب و جوار اور معاشرے و ملک کے اندر اپنی عزت و احترام اور کھوئے ہوئے وقار اور پامال شدہ ساکھ کے ملبے سے تعمیر نو کی بنیاد رکھنے کے لئے خود معمار کی طرح مختلف زاویے، طریقے اور ہنر سکھاتا ہے اور جب تک قاری ان انہدام شدہ کھنڈروں سے نئی عمارت تعمیر نہیں کر لیتا وہ خود بھی ہمت نہیں ہارتا اور نہ ہی قاری کو عزم و استقلال کے ہتھیار رکھنے دیتا ہے۔

ڈیل کارنیگی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک آہنی خود فروخت کرنے والی کمپنی سے کیا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی کتاب "Public Speeking and Influence Men in Business" جو کہ 1931ء میں شائع ہوئی اس کے بعد اس نے بطور استاد وارنزبرگ میں سٹیٹ ٹیچرز کالج میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔

کارنیگی کی کتابیں دنیا کے بیشتر ممالک کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس کی کتابیں ان ممالک کے نصاب میں عملی تدریس کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں جہاں پر اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ مرد و زن کس طرح اور کن اصولوں اور قاعدوں پر عمل کرکے کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ نیز دوسروں سے کس طرح قابل قدر اور قابل احترام رشتوں کو استوار رکھا جا سکتا ہے۔

کارنیگی کتنا بڑا ماہر نفسیات ہے کہ اس نے ایسے موضوعات کو انتخاب کیا کہ اس کے موضوعات سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے مایوسیوں اور محرومیوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے لوگوں کو کامیاب زندگی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ وہ ایک ماہر نباض کی طرح اپنے امراض کا کامیاب سے علاج کرتا ہے جس میں نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکڑی بس صرف اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا شرط ہے۔ کارنیگی ناکامی' نامرادی اور مایوسی جیسی تاریکیوں کے بطن سے مسرتوں کی سحر تک پہنچاتا ہے وہ ہمت اور حوصلے پر اسی قدر یقین رکھتا ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ جیتنے کے لئے وہ پسپائی جیسے الفاظ سے ناآشنا ہے۔

ہم زندگی کی جنگ میں ہارے ضرور ہیں
لیکن کسی محاذ پر پسپا نہیں ہوئے

فکشن ہاؤس کا کردار قابل تحسین ہے کہ وہ بے شمار بین الاقوامی شہرۂ آفاق کتب کے تراجم اور آفاقی حیثیت کی کتابیں شائع کرکے کتابوں کو نئی زندگی اور نئے قارئین دے رہا ہے۔

اسلم کھوکھر
لیکچرار شعبہ اردو
پی۔ اے۔ ایف شاہین کالج لوئر ٹوپہ (مری)

جارج برنارڈ شاء

وہ اس قدر شرمیلا تھا کہ اپنے دوستوں کو ملنے سے گھبراتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دور کا بہترین مقرر بن گیا۔

دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اس قدر مشہور ہوں کہ ان کے نام کی جگہ اکثر ان کے نام کے ابتدائی حروف استعمال کئے جائیں۔ ان میں سے آئرلینڈ کا ایک باشندہ تھا۔ اس کے نام کے ابتدائی حروف جی' بی' ایس ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنے وقت کا سب سے نامور ادیب تھا۔ اس کی ناقابل اعتبار زندگی کی کہانی پر ایک ایسی کتاب لکھی گئی ہے' جس کا عنوان بھی اس کا نام نہیں۔ فقط سرورق پر تین حروف درج ہیں' جی' بی' ایس------ جارج برنارڈشاء۔

شاء کی زندگی عجیب تضادات سے بھری ہوئی تھی۔ مثلاً اس نے فقط پانچ برس سکول میں تعلیم پائی۔ لیکن رسمی تعلیم کی کمی کے باوجود اسے اپنے دور کا عظیم ترین ادیب تسلیم کیا گیا ہے اور اسے زندگی میں وہ اعزاز حاصل ہوا جو ایک ادیب کے لئے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے' یعنی اس نے ادب میں نوبل پرائز حاصل کیا یہ انعام سات ہزار پونڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن جارج برنارڈشاء نے محسوس کیا کہ نہ اسے اعزاز اور نہ ہی روپے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس نے روپیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر اسے اس بات پر رضامند کیا گیا کہ وہ فقط ایک سیکنڈ کے لئے یہ رقم قبول کرلے اور ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے "اینگلو۔ سویڈش ادبی اتحاد" نامی جماعت کے لئے وقف کردے۔

برنارڈشاء کا والد ایک اچھے آئرش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی والدہ نے اپنی ایک امیر چچی کی مرضی کے خلاف برنارڈشاء کے والد سے شادی کی تھی اور اس جرم کی پاداش میں اس کی چچی نے اسے اپنی جائداد سے عاق کر دیا تھا۔ کنبے کی مالی حالت اس قدر پتلی ہو گئی کہ برنارڈشاء کو پندرہ برس کی عمر میں پیٹ پالنے کے لئے مجبوراً" کام کرنا پڑا۔ ملازمت کا پہلا برس وہ ایک پونڈ ماہوار سے بھی کم تنخواہ پر کام کرتا رہا۔

پھر سولہ برس سے بیس برس کی عمر تک وہ ایک ذمہ دار خزانچی کی حیثیت سے فرائض منصبی ادا کرتا رہا۔ اس کی ہفتہ وار تنخواہ 35 شلنگ تھی۔ لیکن اسے دفتری کام سے نفرت تھی' اس کی یہ وجہ تھی کہ اس کی تربیت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جہاں علم و فن اور ادب و موسیقی کی شمعیں روشن تھیں۔ سات برس کی عمر میں برنارڈشاء نے شیکسپئر بن یان' الف لیلیٰ' اور بائبل کا مطالعہ مکمل کر لیا تھا۔ جب وہ بارہ برس کا تھا تو بائرن' ڈکنز' ڈوما اور شیلے اس کی نظر سے گزر چکے تھے' اٹھارہویں برس میں قدم رکھنے سے پہلے وہ ٹائن وال' سٹورٹ مل اور ہربرٹ سپنسر کی نگارشات سے واقف ہو چکا تھا۔ عظیم ادیبوں نے اس کے تصور کو تیز تر کر کے اس کا ذہن عجیب خوابوں کی آماجگاہ بنا دیا تھا اور وہ اسی سبب اپنے دفتری امور میں بالکل دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اس کا تصور تو ادب فن سائنس اور مذہب کے حسن زاروں کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھا۔

اپنی بیسویں سالگرہ سے تھوڑا عرصہ پہلے' جی' بی' ایس نے خود سے کہا:

"زندگی فقط ایک دفعہ حاصل ہوتی ہے۔ میں اسے دفتری الجھنوں کا ہرگز شکار نہ ہونے دوں گا۔"

لہٰذا 1876ء میں وہ ملازمت ترک کر کے لندن چلا آیا جہاں اس کی والدہ موسیقی کا سبق دے کر گذر اوقات کر رہی تھی۔ وہاں برنارڈشاء نے اس ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ جس نے اسے دولت اور دنیا میں شہرت بخشی تھی۔

لیکن ادب سے روزی کمانے سے پیشتر وہ متواتر نو برس تک لکھتا رہا۔ اس نے اپنا سارا وقت لکھنے کے لئے وقف کر دیا وہ ہر روز خود کو پانچ صفحے لکھنے پر مجبور کرتا۔ زیادہ نہیں فقط پانچ صفحے' اس کے متعلق شاء لکھتا ہے۔ "میرے اندر طالب علم اور کلرک ابھی تک چھپا بیٹھا تھا۔ اگر پانچواں صفحہ کسی جملے کے درمیان ختم ہو جاتا تو میں وہ جملہ ادھورا ہی رہنے دیتا۔ اور اسے اگلے دن مکمل کرتا۔"

نو سال کے عرصہ میں اس نے پانچ طویل ناول لکھے۔ ان میں سے ایک کا نام "فنکاروں کے درمیان محبت" تھا۔ اس نے اپنے ہر ناول کا مسودہ انگلینڈ اور امریکہ کے ہر ناشر کے پاس بھیجا لیکن ہر کسی نے انہیں واپس بھیج دیا بعض ناشروں نے اتنا ضرور لکھا کہ وہ اس کی اگلی کوشش کو دیکھنا پسند کریں گے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کسی نے اس کی ادبی صلاحیتوں پر نکتہ چینی نہ کی اور اسے یہ نہ کہا کہ وہ کوئی دوسرا کام کرنے لگے تو بہتر ہو گا۔ بات یہ تھی کہ اس

کے خیالات ان کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

ان دنوں برنارڈشاہ کی مالی حالت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ اس کے پاس اپنے مسودے ارسال کرنے کی خاطر ٹکٹ خریدنے کے لئے بھی پیسے نہ ہوتے تھے ادبی زندگی کے پہلے نو برس میں اس کی آمدنی فقط چھ پونڈ تھی۔

اس کے بدن پر اکثر پھٹے پرانے کپڑے ہوتے اور اس کے جوتوں میں لمبے لمبے سوراخ' لیکن وہ کبھی بھوکا نہ رہا تھا' اس کی والدہ نان بائی اور پرچون فروش سے ادھار لے کر اسے بھوک کے چنگل سے بچاتی رہی۔

اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی نو برس میں اس نے ادب سے پہلے پانچ پونڈ ایک نئی دوا کے متعلق ایک مضمون لکھ کر کمائے۔ چھٹا پونڈ اس نے ایک دفعہ الیکشن کے موقع پر ووٹوں کی گنتی کر کے حاصل کیا۔

تو پھر شاہ زندہ رہنے کے لئے پیسے کہاں سے لیتا تھا۔ اس نے بلا تکلف تسلیم کیا ہے کہ اس کے کنبے کو اس کے سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن وہ کنبے کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے کچھ نہ کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ کنبے کا دست نگر تھا۔ جیسا کہ شاہ نے خود کہا ہے "میں نے خود کو معاش کے بکھیڑوں میں ڈالنے کی بجائے اپنی والدہ کو ڈال رکھا تھا۔"

آخر شاہ فنون لطیفہ کے نقاد کی حیثیت سے خود کفیل ہو گیا۔ اس کی پہلی ادبی اور مالی کامیابی اس کے ناولوں کی بجائے اس کے ڈرامے ثابت ہوئے یہ الگ بات ہے کہ اس کے تمام ابتدائی ڈرامے ناکام نکلے۔

اس بات پر یقین نہیں آتا کہ برنارڈشاہ جو ایک بہترین اور اعلیٰ درجے کا مقرر تھا اور بڑے سے بڑے مجمع کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور عائلی قوانین جمہوری ہیرا پھیری' مذہبی اداروں اور انسانوں کی تقریباً تمام مروجہ روایات پر کھلم کھلا کڑی تنقید کرتا تھا۔ کسی زمانے میں شرمیلے پن' انکساری اور احساس کمتری میں بری طرح مبتلا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے مثلاً جوانی کے دنوں میں شاہ کبھی کبھی ان دوستوں کو ملنے کے لئے جاتا جو لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے رہتے تھے۔ ایسے موقعوں پر شاہ کی کیا حالت ہوتی تھی اس کا نقشہ اس نے خود بیان کیا ہے۔

شرمیلے پن کی اذیت مجھے اس قدر تنگ کیا کرتی کہ میں بعض اوقات اپنے کسی دوست کے دروازے پر دستک دینے سے ہچکچاتا اور کتنی کتنی دیر تذبذب کے عالم میں اس کے مکان

سے ذرا ہٹ کر ادھر ادھر گھومتا رہتا۔ پھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑتا اور راستے میں خود سے کہتا کہ اگر واپس چلے آنا اتنا آسان ہے تو پھر خود کو اذیت میں مبتلا کرنے سے کیا فائدہ' بہت کم لوگ جوانی میں مجھ سے زیادہ بزدل یا دوسرے الفاظ میں شرمیلے ہوں گے۔"

اس کے باوجود برنارڈشاہ معاشرے میں اپنے طرز سلوک کے متعلق اس قدر محتاط تھا کہ لندن کی ہر اچھی لائبریری میں اسے آداب زندگی کے متعلق جو بھی کتاب نظر آئی۔ اس نے پڑھ ڈالی۔ لیکن جس واحد کتاب سے اس نے استفادہ کیا' اس کا نام ہے "اچھے معاشرے کا لب و لہجہ۔"

آخر اس نے اپنے شرمیلے پن اور انکساری پر قابو پانے کے لئے ایک راہ نکالی اور وہ فن تقریر کی ایک کلاس میں داخل ہو گیا۔ پہلے پہل چند دفعہ اس نے اس اعتماد کے ساتھ تقریر کی کہ اگلے چند موقعوں پر اسے مجلس مباحثہ کا صدر بنا دیا گیا اس کے باوجود وہ داخلی طور پر اس قدر گھبرا جاتا کہ ایسے موقعوں پر اس کے لئے اپنی کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے کارروائی کے رجسٹر پر دستخط کرنا مشکل ہو جاتا نوٹس کی عدم موجودگی میں.... اسے یاد نہ رہتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تقریر کرتے وقت اس کی حالت بڑی قابل رحم ہوتی۔ اس کے باوجود لوگ اس کی باتیں سنتے۔ اپنے شرمیلے پن پر قابو پانے کی اس نے قسم کھالی۔ لندن میں جہاں کہیں عوامی جلسہ ہوتا۔ وہ وہاں ضرور جاتا۔ اور اگر اسے بولنے کا موقع مل جاتا تو ضرور بولتا۔ پھر ایک شام جب کہ شاہ کی عمر چھبیس سال کی تھی اس نے "ترقی اور اخلاص" کے مصنف ہنری جارج کی تقریر سنی۔ وہ سنگل ٹیکس کے نظریئے پر اظہار خیال کر رہا تھا۔

یہ تقریر سننے کے بعد شاہ سیاست کی راہ پر چل نکلا اور وہ فورا" زمین کو قومی ملکیت بنانے کے موضوع پر تقریریں کرنے لگا۔ پھر کسی نے اسے بتایا کہ سنگل ٹیکس کے مسئلہ پر کوئی شخص اس وقت تک بحث کرنے کے قابل نہیں ہوتا جب تک اس نے کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" نہ پڑھی ہو۔ اس کتاب کے مطالعہ نے اس کی باقی زندگی پر کیا اثر کیا۔ یہ خود شاہ بتاتا ہے۔ "سرمایہ" کا مطالعہ میری زندگی میں ایک انقلاب سے کم نہ تھا۔ کارل مارکس میرے لئے ایک انکشاف تھا اگرچہ اس کی مبہم اقتصادیات بعد میں میں نے غلط پائی لیکن اس وقت اس نے میرے سامنے ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ اس نے تاریخ اور تہذیب کے حقائق کے بارے میں میری آنکھیں روشن کر دیں اور ان کے متعلق مجھے ایک تازہ

نظریہ عطا کیا۔ مجھے اپنی زندگی کا کوئی مقصد، کوئی نصب العین دکھائی دینے لگا۔ قصہ مختصر اس نے مجھے انسان بنا دیا۔

ہاں اب برنارڈشاہ کا لہو لوگوں میں بولنے لگا تھا۔ اس کا شرمیلا پن۔ اور انکساری جاتی رہی تھی۔ شاہ کے ہاتھ میں ایک کتاب آ گئی تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا کہ ایک شاہ ایک کتاب کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک کتاب جس نے اسے جہاد پر تیار کر دیا اور اس کی اپنی ہستی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اب اسے اپنے نصب العین کے سوا کوئی چیز عزیز نہ تھی۔ اگلے بارہ برس وہ تقریباً ہر رات گلیوں کی نکڑوں پر کھڑا ہو کر، عوامی جلسہ گاہوں اور کلیساؤں میں سوشلزم کا پرچار کرتا رہا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے لیکن وہ ان سے بے نیاز اپنی دھن میں مگن رہا اور ایک دن وہ اپنے وقت کا عظیم مقرر بن گیا۔ آخر ایک مقرر کی حیثیت سے اس کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ لوگ معاوضہ دے کر اس سے تقریریں کرانے لگے۔ لیکن ایسے معاوضے وہ اپنے پر حرام سمجھتا اور یہ رقوم اپنے نصب العین پر خرچ کرتا۔

1896ء میں برنارڈشاہ شارلٹ ٹاؤن شنیڈ نامی ایک خاتون سے ملا اس وقت شاہ چالیس برس کا کنوارا اور شارلٹ 39 برس کی کنواری خاتون تھی شارلٹ کو ورثے میں خاصی دولت ملی تھی۔ شاہ کو ان دنوں امریکہ میں اپنے ایک ڈرامے کی کامیابی پر بیس ہزار پونڈ ملے تھے۔ شارلٹ معاشرتی زندگی سے تنگ آ چکی تھی اور سوشلزم سے بہت متاثر ہوئی تھی وہ شاہ میں دلچسپی لینے لگی اور اس حقیقت سے اسے آگاہ کر دیا۔ بعد میں وہ شاہ کو خود پسند اور ظالم کہا کرتی تھیں۔

دو برس گزر گئے۔ اس دوران میں شاہ کو شادی کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ آخر مارچ 1898ء میں شارلٹ میونسپل اداروں کے مطالعے کی غرض سے روم چلی گئی۔ جب وہ روم پہنچی تو اسے ایک تار ملا۔ شاہ بڑا سخت بیمار تھا وہ الٹے قدموں لندن واپس لوٹ آئی۔ زیادہ کام کرنے سے شاہ کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ جس گندے کمرے میں وہ کام کیا کرتا تھا اس کی حالت دیکھ کر شارلٹ کو سخت صدمہ ہوا۔

اس کمرے کے متعلق شاہ خود ہی کہا کرتا تھا کہ اسے تو فقط بارود کا ایک فیتہ ہی صاف کر سکتا ہے اگر سات جوان لڑکیاں اور سات جوان لڑکے نصف صدی تک یہ کمرہ صاف کرتے رہیں۔ تو پھر بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو گا۔"

جب سبز آنکھوں والی شارلٹ نے شاء کو وہ کمرہ چھوڑنے اور اسے اپنے ہمراہ اپنے گاؤں چلنے پر مجبور کیا تو شاء نے اس سے کہا کہ وہ پہلے بازار جا کر ایک انگوٹھی اور شادی کا لائسنس لے آئے۔

انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے پینتالیس برس بڑے ہنسی خوشی سے گزارے۔ مسز شاء کا انتقال 12 ستمبر 1943ء کو ہوا۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ وہ شاء سے بیس برس چھوٹی تھی اور شاء اس سے پہلے مرے گا۔ لیکن حقیقت میں ان کی باہمی عمروں کا فرق صرف چار ماہ تھا۔

اگرچہ شاء 1856ء میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس نے 1946ء میں اعلان کیا تھا کہ وہ اس قدر مصروف ہے کہ ابھی موت کے بارے میں سوچنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں۔ اس نے کہا تھا۔ "میں زندگی میں زندگی کی خاطر دلچسپی لیتا ہوں' یہ میرے نزدیک کوئی مختصر شمع نہیں۔ میرے لئے یہ ایک شاندار مشعل ہے اور میرے ہاتھ میں ہے۔ اسے آئندہ پود کے سپرد کرنے سے پہلے میں اسے زیادہ سے زیادہ روشن دیکھنا چاہتا ہوں۔"

جنرل جیمز ڈولٹل

اپنے ٹوٹے ہوئے گھٹنوں کے باوجود وہ ہوائی جہازوں کے مقابلے میں اول آیا۔

"جس دن جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اس وقت جمی ڈولٹل ہوائی فوج میں میجر تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا میں ہوائی فوج میں ایک مقام حاصل کر کے رہوں گا۔ اور ٹوکیو پر ایسی بمباری کروں گا کہ جاپانی یاد کریں گے۔"

چار ماہ اور گیارہ دن بعد اس نے اپنے الفاظ سچ کر دکھائے۔ ٹوکیو کی چھبیس سو سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اس پر بم برسے' ان بموں نے ٹوکیو میں افراتفری پھیلا دی۔ ان بموں نے ایک جنگی جہاز اور ہوائی جہازوں کی ایک فیکٹری تباہ کر دی اور تیل کے ذخیروں میں یوں آگ لگائی کہ لوہے کے ٹکڑے میلوں فضا میں اچھل گئے ٹوکیو پر ہوائی حملہ اس قدر کامیاب تھا کہ ٹوکیو کی دفاعی فوج کے افسر انچارج نے خود کشی کر لی۔

اس کے بعد ڈولٹل کو شمالی افریقہ میں امریکی ہوائی فوج کا کمانڈر اور بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا۔ جب اتحادی بری فوجیں سسلی کی زمین پر اتر رہی تھیں تو اس کے جنگی جہازوں نے اپنی حفاظت میں ان کا یہ کام آسان کر دیا۔ یہ اسی کے لڑاکے طیارے تھے جنہوں نے اٹلی کو گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چند برس پہلے مجھے جمی ڈولٹل سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک حیرت انگیز شخصیت ہے اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ کئی برس پہلے چلی (جنوبی امریکہ) میں اسے پیش آیا۔ شمالی امریکہ' جنوبی امریکہ اور یورپ سے آئے ہوئے ہوا بازوں کا ایک گروپ ایک ہوٹل میں دعوت پر مدعو تھا۔ ہر کوئی اپنے جوہر دکھا رہا تھا۔ جمی ڈولٹل جو تھوڑا بہت بازی گر بھی ہے۔ کمرے کی کھڑکی کے پاس گیا اور دونوں ہاتھ اس کی دہلیز پر ٹیک کر ٹانگیں اونچی کر کے سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کھڑکی کے دونوں پٹ پکڑے اور باہر سڑک کی طرف جھک کر ہوا میں افقی انداز سے معلق ہو گیا۔ کھڑکی کا ایک پٹ پرانا تھا اچانک وہ ٹوٹ گیا۔ جمی نے جلدی سے ایک ہاتھ سے کھڑکی کی دہلیز پکڑ لی اور ہوا میں لٹک

گیا لیکن اس کا ہاتھ زیادہ دیر اس کے جسم کا بوجھ برداشت نہ کر سکا اور جمی تیس فٹ کی بلندی سے نیچے سڑک پر گر پڑا اور اس کے دونوں گھٹنے ٹوٹ گئے۔ گرنے کے عمل کو جمی نے اس طرح بیان کیا۔ "جونہی میں سڑک سے ٹکرایا میری ملاقات اپنے ٹوٹے ہوئے گھٹنوں سے ہو گئی۔"

اگر میں زمین سے تیس فٹ اوپر ہوا میں معلق ہو جاتا تو یقیناً مدد کے لئے شور مچا دیتا۔ میں نے جمی ڈولٹل کی بیوی سے پوچھا کہ جب جمی کو معلوم تھا کہ وہ سڑک پر گر پڑے گا تو اس نے مدد کے لئے کیوں نہ پکارا۔ اس نے جواب دیا کہ جمی مر جاتا۔ لیکن کسی کو مدد کے لئے ہرگز نہ پکارتا۔

جمی کے ساتھ یہ حادثہ 35 برس پہلے پیش آیا تھا۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ زیادہ چلنے پر اب بھی جمی کے گھٹنوں میں درد اٹھنے لگتا ہے۔

لیکن جمی ڈولٹل اس وقت چلی میں کیا کر رہا تھا اسے وہاں یورپ میں ساختہ ہوائی جہازوں کے مقابلے میں امریکی ساختہ ہوائی جہازوں کا آرڈر لینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ چلی کے صدر کے سامنے جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے بہترین ہوا باز اپنے اپنے ملک کے جہازوں کی برتری کا مظاہرہ کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

مظاہرے کا مقررہ دن آ پہنچا۔ کوئی یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ جمی ڈولٹل مظاہرے کے دن وہاں موجود ہو گا۔ وہ تو اپنے دونوں ٹوٹے ہوئے گھٹنے لئے ہسپتال میں پڑا تھا۔ لیکن جمی نے لوگوں کو بے وقوف بنا دیا۔ اس نے ہسپتال میں چوری چھپے اپنے گھٹنوں پر سے پلستر اکھاڑا اور وہاں سے چھپتا چھپاتا مظاہرے کے میدان میں آ پہنچا۔ اور بڑی مشکل سے اپنے ہوائی جہاز میں بیٹھنے میں کامیاب ہوا۔ پھر اس نے فضا میں جا کر ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ جنوبی امریکہ کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی ایسے کھیل نہ دیکھے ہوں گے۔ ہوائی جہازوں کا آرڈر اسے مل گیا لیکن جب وہ ہوائی جہاز سے باہر نکلا تو اس کے دونوں گھٹنے دوبارہ ٹوٹ چکے تھے۔ ہسپتال کا سرجن اس کی اس حرکت پر اس قدر ناراض ہوا کہ اس نے جمی کے گھٹنوں پر دوبارہ پلستر لگانے سے انکار کر دیا۔ جمی نے خاموشی سے اپنے ایک دوست کی مدد سے گھٹنے ایک کپڑے کے ساتھ زور سے باندھے اور اپنے جہاز میں بیٹھ کر پندرہ سو میل طے کر کے بولیویا پہنچ گیا۔ تاکہ وہاں کی حکومت کے پاس اپنے جہاز فروخت کر سکے۔ لیکن جب وہاں کی حکومت نے اس پر جاسوس ہونے کا شبہ کر کے اسے قید کرنا چاہا تو وہ دوبارہ اپنے ٹوٹے ہوئے گھٹنوں کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر واپس بھاگ آیا۔

جمی ڈولنٹل نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز الاسکا سے کیا۔ وہ الاسکا میں آٹھ برس رہا۔ اس کی یہ وجہ تھی کہ اس کا والد بھی ان جوشیلے لوگوں کے گروہ میں شامل تھا جو سنگوئے میں سونے کی تلاش میں بھاگم بھاگ آئے تھے۔

جمی ڈولنٹل کو بچپن میں بڑے اکھڑ قسم کے کھیل پسند تھے۔ لڑائی میں اسے بڑا مزہ آتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ سکول میں سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ لہٰذا اسے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے دوسرے لڑکوں کو مارنا پڑتا۔ ایک ہفتے کی رات کو وہ ایک گلی کی نکڑ پر دو لڑکوں کو پیٹ رہا تھا کہ ایک سپاہی ادھر آ نکلا اور اسے پکڑ کر تھانے لے گیا۔ پھر اس نے جمی پر رحم کھا کر اس کی ماں کو ٹیلی فون کیا۔ "مسز ڈولنٹل مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک بری خبر سنا رہا ہوں، میں آپ کے بیٹے جمی کو لڑنے کے جرم میں پکڑ کر تھانے لے آیا ہوں۔ اور ہم نے اسے قید کر دیا ہے۔" وہ ہفتے کی رات تھی۔ جمی کی والدہ آئرش تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے بخوبی واقف تھی لہٰذا اس نے جواب دیا۔ "بہت اچھا سارجنٹ! اطلاع دینے کا شکریہ۔ میں اسے پیر وار کو لینے آؤں گی۔"

جب جمی ڈولنٹل کیلی فورنیا واپس آیا تو وہ اپنے ہائی سکول میں باکسنگ کا چیمپئن قرار دیا گیا۔ جمی پیشہ ور باکسر بننا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے والد کے دل میں ابھی تک سونا تلاش کرنے کا ولولہ جاگ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے جمی کو کانوں کا انجینئر بننے کی ترغیب دی۔ جمی تین برس تک کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں کان کنی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اسی زمانے میں کیلی فورنیا یونیورسٹی اور...... فورڈ یونیورسٹی کے درمیان باکسنگ کے مقابلے ہونے والے تھے۔ لیکن فورنیا یونیورسٹی اپنے پرانے حریف کو شکست دینے کی فکر میں تھی۔ جمی ڈولنٹل بھی مقابلے میں شرکت کے لئے تیاری کرنے لگا۔

چند روز بعد باکسنگ کے مقابلے شروع ہو گئے۔ جمی ڈولنٹل اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے دائرے میں آیا اس کا قد فقط پانچ فٹ چھ انچ تھا اور اس کے مخالف کھلاڑی کا قد چھ فٹ سے اوپر۔ تماشائی اس تضاد سے ہنسنے لگے۔ ان کے خیال میں یہ ایک مذاق تھا۔ اس کے مخالف باکسر نے بھی اسے مذاق ہی سمجھا ورنہ کیا وہ اس ٹھگنے سے مقابلہ کرنے آیا تھا؟ اس نے سوچا کہ وہ چند منٹ میں جمی کو مار گرائے گا۔

اتنے میں مقابلہ کی گھنٹی بج گئی۔ جمی نے اپنے حریف کی ٹھوڑی پر پہلے ہی راؤنڈ میں ایسے زور کا مکہ مارا کہ وہ فرش پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ مقابلہ لوگوں کی امیدوں کے خلاف چشم زدن میں ختم ہو گیا اور کیلی فورنیا یونیورسٹی جیت گئی۔

جیمز ڈولٹل کے دو بیٹے ہیں۔ ان میں سے ایک ہوائی فوج اور دوسرا ویسٹ پوائنٹ میں ملازم ہے۔ جمی نے بچپن ہی میں انہیں لڑنا سکھانا شروع کر دیا تھا۔ جمی کی بیوی نے مجھے بتایا کہ جمی گھٹنوں کے بل جھک کر انہیں مکہ بازی کی مشق کرایا کرتا تھا۔

جمی نے اپنے بڑے لڑکے سے وعدہ کیا کہ جس دن وہ باکسنگ میں اپنے باپ کو ہرا دے گا۔ اسی روز اسے ایک گھوڑا بطور انعام ملے گا' لڑکا یہ انعام کبھی نہ جیت سکا۔ لیکن ایک دفعہ اس نے دوستانہ مقابلے میں اپنے والد کا ایک دانت ضرور توڑ دیا۔ کیا جمی کو اس کا افسوس ہوا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو اس پر نازاں تھا۔ دوسرے دن ہوائی سفر کی ایک کانفرنس میں وہ ہر ایک کو.... اپنا ٹوٹا ہوا دانت دکھاتا اور کہتا "یہ میرے بیٹے کا کارنامہ ہے۔"

اپنی تمام معرکہ آرائیوں کے باوجود جنرل جیمز ڈولٹل ایک منکسرالمزاج انسان ہے۔ چند برس پہلے کا ذکر ہے کہ نامور ہوا باز فرینک ہاکس ہوا بازی کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ اس نے اصرار کر کے جمی ڈولٹل کو اپنے تجربات کے متعلق ایک باب لکھنے کے لئے کہا لیکن جمی نے اپنے تجربات کے بجائے ایک دوسرے شخص کے کارناموں کا ذکر کر دیا اور اپنا نام تک نہ لیا۔

جمی ڈولٹل اپنی غلطیوں کی وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی اپنا الزام دوسروں کے سر پر تھوپتا ہے۔ مثلاً جب 1922ء میں وہ باقاعدہ فوج میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا تو اس سے رات کے وقت فلوریڈا میں ہوائی اڈے سے پرواز کرتے وقت ڈی ایچ۔ 4 مارکہ ایک جنگی طیارہ ایک کھمبے سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ جب اس کے ساتھی افسروں نے اسے تباہ شدہ جہاز کے قریب کھڑا دیکھا تو انہوں نے حادثے کی وجہ پوچھی۔ جمی نے ہوائی جہاز پر الزام دھرنے کی کوشش نہ کی۔ اس نے جواب دیا "ٹھیک طرح سے چلانا جو نہیں آتا تھا۔"

کسی بات یا حادثے کے متعلق جمی ڈولٹل کی رپورٹیں بڑی مختصر مگر صحیح ہوتی ہیں' 1929ء میں ہوائی مظاہروں کے وقت جمی کو ایک خاص جہاز دیا گیا۔ جمی نے وہ طیارہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہوائی کرتب دکھانے سے پہلے جمی نے اسے ایک دفعہ آزمانا بہتر خیال کیا۔ وہ جلدی سے طیارے کو اوپر لے گیا اور پھر ناک کے بل تین سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اسے نیچے لایا۔ اچانک جہاز کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ جمی جہاز سے باہر ہوا میں گر پڑا وہ پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اترنے لگا۔ زمین پر آ کر اس نے ایک دوسرا طیارہ لیا اور کرتب دکھانے لگا۔ فوج نے اسے اس حادثے پر مکمل رپورٹ دینے کے لئے کہا لیکن جمی نے فقط یہ جملہ لکھا "بازو ٹوٹ گیا اور میں باہر گر پڑا۔"

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

جمی ڈولٹل عملی مذاق کا بڑا شوقین ہے۔ چند برس ہوئے اسے ہوائی سفر کے متعلق ماہروں اور سائنس دانوں کی ایک کانفرنس میں تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا۔ تقریر کے دوران اس نے ان جدید ہتھیاروں اور نئے بموں کا ذکر کیا۔ جنہیں فوج تیار کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی ڈبیا اٹھا کر کہا۔ "یہ سب سے خطرناک بم ہے۔ اگر یہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑے تو آپ لوگوں کے ہمراہ اس عمارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔" لیکن حقیقت میں اس ڈبیا میں پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تیس سیکنڈ کے بعد جمی ڈولٹل نے جان بوجھ کر تقریر کرتے وقت ڈائس پر اس طرح ہاتھ مارا کہ وہ ڈبیا فرش پر گر پڑی جمی نے پہلے ہی انتظام کر رکھا تھا کہ جونہی ڈبیا فرش پر گرے سارے ہال کی روشنیاں بجھا دی جائیں اور سٹیج کے عقب سے چند فوجی ہال میں لوگوں کے سروں کے اوپر خالی فائر کرنے لگے۔ افراتفری کے عالم میں لوگ ایک دوسرے سے ٹکراتے اور ان کے سگریٹ ایک دوسرے کا منہ جلانے لگے۔

جمی ڈولٹل نے 1918ء میں اپنی ایک ہم جماعت لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ پیار سے اسے ڈچز آف ڈولٹل کہتا ہے۔ میں نے ڈچز سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی جمی کو متفکر دیکھا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے آج تک اسے نہ تو کبھی کسی بات پر متفکر اور نہ ہی کبھی غمزدہ دیکھا ہے۔"

بریگیڈیئر جنرل جمی ڈولٹل کی جرات، علم اور تجربات پر مبنی ہے۔

اس نے 1924ء میں ماساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے ایم، ایس، سی کی ڈگری حاصل کی اور اگلے برس اسی ادارے نے اسے ڈاکٹریٹ دے دی۔ چند برس ہوئے اسے "ہوائی سائنس" کے ادارے کا صدر چنا گیا تھا۔ ہوائی صنعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں یہ اعزاز سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔

1942ء میں جنرل ڈولٹل کو زندگی بھر کی خدمات کے عوض "گوگن ہم میڈل" دیا گیا اور ہوا بازی میں اس نے جو معرکے سر کئے تھے، ان کا اعتراف کیا گیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مادام کیوری

دنیا کی سب سے نامور خاتون سائنس دان کسی زمانے میں خود کو گرم رکھنے کے لئے رات کو اپنے اوپر کتابوں کا ڈھیر رکھ لیا کرتی تھی۔

مادام کیوری جس کا شمار ان چند خاتون شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ پولینڈ کی رہنے والی ایک منکسر مزاج اور شرمیلی لڑکی تھی۔ اس نے وہ چیز دریافت کی جسے بڑے بڑے سائنس دان ناممکنات میں شمار کرتے تھے اس نے ایک نیا عنصر دریافت کیا۔ ان تمام عناصر سے مختلف جسے سائنس جانتی تھی۔ ایک ایسا عنصر جو قوت کو بے حد روشن بنا دیتا تھا اس نے اس عنصر کا نام ریڈیم رکھا۔

ریڈیم کینسر کے علاج میں بے حد مفید ثابت ہوا ہے۔ کینسر کے لاکھوں مریض یا تو مستقل طور پر صحت یاب ہو گئے ہیں یا پھر ان کی بیماری میں کمی واقع ہو گئی ہے اور ان کی زندگیوں میں کئی برس کا اضافہ ہو گیا ہے۔

لیکن جب مستقبل کی مادام کیوری پیرس کی یونیورسٹی میں فزکس اور ریاضی کا مطالعہ کر رہی تھی تو وہ اس قدر مفلس ہوتی تھی کہ اکثر بھوک کے مارے بیہوش ہو جاتی اگر اسے ان دنوں یہ معلوم ہو جاتا کہ پچاس برس بعد ایک فلم کمپنی دو لاکھ پونڈ خرچ کر کے اس کی زندگی کے متعلق ایک فلم بنائے گی تو کیا اسے حیرت نہ ہوتی؟ اگر اسے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ وہ ایسی واحد شخصیت ہو گی جسے سائنس کی خدمات کے عوض دو مرتبہ نوبل پرائز ملے گا۔ تو کیا اسے حیرت نہ ہوتی؟ پہلی مرتبہ اسے 1903ء میں فزکس میں نمایاں کام کرنے اور پھر 1911ء میں کیمسٹری میں نمایاں کام کرنے پر نوبل پرائز ملا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر جوانی میں پولینڈ کا ایک خوش حال کنبہ اس کی بے عزتی نہ کرتا تو وہ نہ ہی ایک سائنس دان بنتی اور نہ ہی ریڈیم دریافت کر سکتی۔

ہوا یوں کہ جب ابھی وہ انیس برس کی ایک نوجوان لڑکی تھی تو پولینڈ کے ایک خوشحال کنبے نے اپنی ایک دس سالہ لڑکی کی تعلیم و تربیت کے لئے ملازم رکھ لیا۔ جب اس متمول کنبے کا … لڑکا کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا تو وہ نوجوان استانی کے ساتھ اکثر ڈانس کرتا رہتا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

وہ اس کے اچھے آداب اور شاعرانہ خیالات اور حس مزاح سے بڑا متاثر ہوا۔ اسے اس سے محبت ہو گئی اور اس نے مستقبل کی مادام کیوری سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا لیکن جب لڑکے کی والدہ تک یہ خبر پہنچی۔ تو وہ تقریباً بے ہوش ہو گئی۔ اس کے باپ نے شور برپا کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ یہ کیا؟ اس کا لڑکا ایک مفلوک الحال لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا اور جو دوسروں کے گھر میں ملازمت کرتی پھرتی تھی۔

بے عزتی کے اس تھپڑ نے مادام کیوری کو حیران و ششدر کر دیا۔ اس قدر حیران کہ اس نے شادی کا خیال ذہن سے نکال کر پیرس جانے اور وہاں تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی سائنس کی خدمات کے لئے وقف کرنے کا تہیہ کر لیا۔

1891ء میں یہ نوجوان لڑکی جس کا نام مانیہ سکلوڈ ووسکا تھا' پیرس آئی اور یونیورسٹی آف پیرس میں سائنس کی طالب علم بن گئی۔ وہ اس قدر شرمیلی تھی کہ کوئی دوست نہ بنا سکی۔ دراصل وہ اپنے مطالعے میں اس قدر محو ہو گئی کہ دوست بنانے کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہ ہوتا تھا وہ ہر اس پل کو بیکار تصور کرتی جو مطالعہ پر صرف نہ ہوتا تھا۔ اگلے چار برس اس نے فقط اس اثاثے پر زندگی بسر کرنا تھی۔ جو اس نے ملازمت کر کے جمع کر رکھا تھا۔ یا پھر اس کی ماں اسے کبھی کبھار تھوڑے بہت پیسے بھیج دیا کرتی تھی۔ وہ تین شلنگ روزانہ کے حساب سے خرچ کرتی۔ ان تین شلنگوں میں کمرے کا کرایہ' خوراک' لباس اور یونیورسٹی کے اخراجات شامل تھے اس کا کمرہ چوتھی منزل پر واقع تھا اور اس میں فقط ایک دریچہ تھا۔ اس میں نہ تو گیس' نہ ہی بجلی اور نہ ہی گرمی کا انتظام کیا گیا تھا وہ ساری سردیاں کوئلے کی دو بوریوں سے زیادہ نہ خرید سکتی تھی۔

اپنے کوئلے کے خزانے کو بچانے کے لئے وہ اکثر زمستان کی راتوں میں آتشدان روشن نہ کرتی اور بیٹھی منجمد انگلیوں اور کپکپاتے ہوئے کندھوں سے ریاضی کے سوال حل کرنے میں مصروف رہتی۔ پھر سونے سے پیشتر خود کو گرم کرنے کی خاطر وہ صندوق میں سے اپنے تمام کپڑے نکال کر کچھ چارپائی پر بچھا دیتی اور کچھ اوپر اوڑھ لیتی۔ اس پر بھی اس کی سردی کم نہ ہوتی تو وہ کرسی پکڑ کر اسے اپنے اوپر رکھ لیتی تاکہ اسی کے وزن سے اسے کم سردی محسوس ہو۔

اسے اپنا چھوٹا موٹا کھانا بھی خود ہی پکانا پڑتا۔ لیکن کھانا کھانے میں جو وقت صرف ہوتا۔ مادام کیوری کے نزدیک وہ ضائع ہو جاتا۔ وہ کئی کئی ہفتے فقط مکھن اور ڈبل روٹی پر گزر

اوقات کرتی۔ اکثر اس کا سر چکرانے لگتا۔ اور وہ بستر پر گر کر بے ہوش ہو جاتی۔ جب وہ ہوش میں آتی تو اپنے آپ سے کہتی "میں بے ہوش کیوں ہوئی تھی؟ وہ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھی کہ اس کی بیماری کی وجہ فاقہ ہے۔ ایک دفعہ وہ کلاس روم میں بے ہوش ہو گئی اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے ڈاکٹر کے سامنے تسلیم کر لیا کہ وہ کئی روز سے سوکھی روٹیوں پر گزارا کر رہی تھی۔

لیکن ہمیں اس طالبہ کے حال زار پر زیادہ افسوس نہ کرنا چاہیے۔ یہ طالبہ جسے دس برس بعد دنیا کی مشہور ترین عورت بننا تھا۔ وہ اپنے مطالعے میں اس قدر مستغرق رہتی کہ اسے بھوک کا خیال ہی نہ آتا۔ بھوک اسے متزلزل اور اس کے داخلی آگ کو ٹھنڈا کرنے سے قاصر تھی۔

تین برس بعد مانیہ سکلوڈوسکا نے پیرس میں ایک ایسے شخص سے شادی کر لی کہ فقط اسی کے ساتھ وہ خوش رہ سکتی تھی۔ وہ شخص بھی اس کی طرح سائنس کا دیوانہ تھا۔ اس کا نام پاٹری کیوری تھا۔ اس وقت اس کی عمر فقط پینتیس برس کی تھی اس کے باوجود اس کا نام فرانس کے نامور سائنس دانوں میں شمار ہوتا تھا۔

جس روز انہوں نے شادی کی ان کی دنیوی جائداد فقط دو سائیکل تھے وہ ہنی مون منانے کے لئے اپنی سائیکلوں پر فرانس کے دیہات میں نکل گئے وہ ڈبل روٹی پنیر اور پھل کھاتے اور رات کو ایسی سراؤں میں سوتے جہاں شمعوں کی روشنیوں سے خستہ حال دیواروں پر عجیب و غریب سائے رینگنے لگتے۔

تین برس بعد مادام کیوری ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے کی تیاری کر رہی تھی فلسفے میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے منفرد سائنسی تحقیق کی ضرورت تھی اور اس کے متعلق مضمون لکھنا پڑتا تھا۔ اس نے اپنی تحقیق کی بنیاد یہ بھید معلوم کرنے پر رکھنے کا فیصلہ کر لیا کہ یورنیم دھات میں سے روشنی کیوں نکلتی ہے۔

یہ ایک عظیم سائنسی معرکے کا آغاز تھا۔ علم کیمیا کے سربستہ رازوں میں ایک دلچسپ سفر۔

مادام کیوری نے تمام کیمیاوی چیزوں کو ٹیسٹ کیا اور یہ جاننے کے لئے کہ کیا دوسری دھاتوں میں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ سینکڑوں دھاتوں پر تجربے کئے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ شعاعیں کوئی بے نام عنصر فضا میں بکھیرتی ہیں۔ اس نئے پر اسرار عنصر کو معلوم کرنے کے لئے مادام کیوری کا شوہر بھی اس کے ساتھ تجربات میں شریک ہو گیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کئی ماہ کے تجربات کے بعد مادام کیوری اور اس کے شوہر نے دنیائے سائنس میں ایک بم گرا دیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے خیال کے مطابق انہوں نے ایک ایسا عنصر دریافت کیا ہے جس کی روشنی یورینیم کی روشنی سے بیس لاکھ گنا زیادہ ہے۔ ایک ایسی دھات جس کی شعاعیں، لکڑی، پتھر، لوہے اور تانبے میں سے گزر سکتی تھیں۔ ایک حیرت انگیز دھات جس کی روشنی فقط سکہ روک سکتا تھا اگر انہوں نے واقعی کوئی ایسی دریافت کی تھی تو اس کا مطلب تھا۔ انہوں نے وہ تمام بنیادی نظریئے تہ و بالا کر دیئے تھے۔ جس پر سائنس دان صدیوں سے یقین کرتے چلے آ رہے تھے۔

انہوں نے اس حیران کن مادے کا نام ریڈیم رکھا۔

اس قسم کی کوئی چیز پہلے کبھی سننے میں نہ آئی تھی۔ یہ دوسری تمام دھاتوں کے اس قدر مختلف تھی کہ اچھے سائنس دان کسی ایسی دھات کی موجودگی کو مشکوک سمجھتے تھے۔ انہوں نے ثبوت کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ہمیں خالص ریڈیم دکھایا جائے۔

لہٰذا اگلے چار برس (1902ء-1898ء) مادام کیوری اور اس کا شوہر ریڈیم کی موجودگی کا ثبوت مہیا کرنے کے لئے کام کرتے رہے۔ مٹر کے دانے جتنا ریڈیم حاصل کرنے کے لئے پورے چار برس!

آخر انہوں نے اسے کس طرح حاصل کیا؟ آٹھ ٹن لوہے کو ابال کر عمل تقطیر کے ذریعے۔ وہ ایک پرانے خستہ حال احاطے میں کام کیا کرتے تھے جسے میڈیکل کے طلباء پہلے جراحی کے لئے استعمال کرتے تھے اب وہ اس کام کے لائق بھی نہ رہا تھا۔ اس کا فرش ہی نہ تھا۔ چھت ٹوٹی ہوئی تھی روشنی سے بالکل محروم سردیوں میں وہ برف کی طرح سرد ہوتا تھا۔ بھٹی میں سے اٹھنے والا دھواں مادام کیوری کی آنکھوں اور حلق کے لئے مہلک ثابت ہو رہا تھا۔ چار برس تک میاں بیوی خستہ حال احاطے میں کام کرتے رہے۔ آخر مسٹر کیوری نے بیزاری کے عالم میں مادام کیوری سے کہا کہ وہ اس تجربے کو کسی اچھے وقت پر ملتوی کر دے تو بہتر ہو گا۔ لیکن مادام کیوری نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا وہ اپنے تجربے میں جتے رہے اور آخر ریڈیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس دریافت کا یہ نتیجہ ہوا کہ مادام کیوری روئے زمین کی مشہور ترین خاتون بن گئی۔ لیکن کیا شہرت اور عظمت کے وہ دن اس کے لئے مسرور ترین دن تھے؟ بالکل نہیں، وہ بار بار کہا کرتی کہ اس کی زندگی کے بہترین ایام وہی تھے، جب وہ مفلسی کے عالم میں اپنے شوہر کے ہمراہ اس گندے اور بوسیدہ احاطے میں کام کیا کرتی تھی۔ وہ ایام جب اس کے پاس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سردی کی یلغار روکنے کے لئے کپڑے نہ ہوتے تھے اور وہ بھوک اور نقاہت کے عالم میں اکثر بیہوش ہو جاتی تھی۔ وہ ایام جب وہ فقط کام کیا کرتی تھی۔

1902ء میں مادام کیوری اور اس کے شوہر نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا وہ امیر بننا چاہتے ہیں یا سائنس کی بے لوث خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنا چاہتے ہیں اس وقت تک یہ دریافت ہو چکا تھا کہ ریڈیم کینسر کے علاج میں بے حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ریڈیم کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اسے تیار کرنے کا طریقہ دنیا میں فقط مادام کیوری اور اس کے شوہر کو معلوم تھا۔ وہ اپنی ایجاد کے حقوق کسی کمپنی کے پاس لاکھوں پونڈ میں فروخت کر سکتے تھے۔

چونکہ ریڈیم کو ایک نفع بخش تجارت بنایا جا رہا تھا۔ لہٰذا اگر مادام کیوری اسے کسی کمرشل کمپنی کے ہاتھوں فروخت کر بھی دیتی تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس طرح حاصل کی ہوئی رقم ان کے بچوں کے لئے مالی تحفظ کا سامان بن جاتی اور وہ آئندہ تحقیق کے لئے ایک شاندار تحقیق گاہ بھی تعمیرا کر سکتے تھے۔ لیکن یہ جان کر انسانی فطرت پر انسان کا اعتقاد بڑھ جاتا ہے کہ مادام کیوری نے اپنی ایجاد کے عوض ایک پائی بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ "یہ سائنس کے جذبے اور مقصد کے برعکس ہو گا۔ اس کے علاوہ ریڈیم کو ایک مہلک مرض کے خلاف بطور مفید ہتھیار کے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے مجھے اس صورت حال سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہیئے۔"

اس طرح اس نے اپنے غیر معمولی اور پیغمبروں جیسی بے غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امارت کے بجائے انسانی خدمت کا راستہ پسند کیا۔

○

جنرل جارج سی مارشل

وہ بڑی بڑی خبروں کا خالق ہے مگر خود انہیں سننے میں دلچسپی نہیں لیتا۔

کچھ عرصہ پہلے تک امریکی فوج کا بہترین آدمی چیف آف سٹاف جنرل جارج سی مارشل تھا۔

امریکی فوج کا یہ سابق نمبر ایک آدمی کس قسم کی شخصیت تھا؟ جنرل' جے' فرینکلن بل جو خود بھی امریکی فوج کا چیف آف سٹاف رہ چکا ہے۔ اس نے فلپائن میں جنرل مارشل کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سٹون وال جیکسن کے بعد اگر امریکہ میں کوئی فوجی جنئیس پیدا ہوا ہے تو وہ جنرل مارشل ہے۔

فوجی راہنما کی حیثیت سے سٹون وال جیکسن سے کسی کا موازنہ کیا جانا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ امریکی جنگ آزادی کے دوران سٹون وال جنوبی امریکہ میں ایک محبوب فوجی راہنما کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابراہام لنکن نے اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر خدا کے حضور دعا مانگی تھی کہ شمالی امریکہ میں بھی فوجوں کی قیادت کے لئے سٹون وال جیکسن جیسا فوجی افسر اسے مل جائے۔ سٹون وال جیکسن نے ریاست ورجینیا کی وادی شینندوہ میں جس طرح تحریک چلائی تھی اسے دنیا کی فوجی تاریخ میں بہترین تحریک تصور کیا جاتا ہے اور آج تک یورپ کے فوجی کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

جنرل پرسنگ جس نے پہلی جنگ عظیم میں امریکی فوجوں کی یورپ میں قیادت کی تھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جنرل مارشل 1918ء میں امریکی فوج کا بہترین افسر تھا پرسنگ نے جنرل مارشل کو یورپ میں مقیم فرسٹ امریکن آرمی کا چیف افسر بنا دیا تھا۔ جنگ کے دوران میں فوج کی نقل و حرکت کا منصوبہ وہی تیار کرتا تھا۔

اس حیثیت سے اس نے بڑی روشن دماغی سے پہلی جنگ عظیم میں پیش آنے والا نقل و حرکت کا ایک بے حد گنجلک مسئلہ حل کیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل پرسنگ پانچ لاکھ سے زیادہ آدمی- تین ہزار گن مشینیں' بارود کے چالیس ہزار ٹن اور چونتیس ہسپتال- سینٹ مائیل سے آرگون منتقل کرنا چاہتا تھا- مسئلہ یہ تھا کہ نقل و حرکت دشمن کے جاسوسوں کو معلوم ہوئے بغیر کی جائے- جنرل مارشل نے ایسا ہی کر دکھایا- اس نے دو ہفتوں کے اندر اندر راتوں کو خفیہ طور پر فوجیں اور اسلحہ آرگون پہنچا دیئے- جرمنوں کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہو رہا ہے- حتیٰ کہ پانچ لاکھ امریکی سپاہی میوزی----- آرگون محاذ پر پہنچ گئے اور انہوں نے جرمن سپاہیوں کی صفیں چیر دیں- یہ ایک ایسا حملہ تھا جس نے پہلی جنگ عظیم جیتنے میں بڑی مدد دی- ابراہام لنکن نے ایک دفعہ کہا تھا "فوجی معاملات میں ایک بڑے ذہن پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے-"

جنرل مارشل تنظیم کا بے حد قائل ہے- لیکن ایسی تنظیم نہیں جو ہتک آمیز اور غیر انسانی ہو جسے فوج میں اکثر روا خیال کیا جاتا ہے اور جس پر کئی افسر بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں-

جب جنرل مارشل چیف آف سٹاف بنا تو اس نے بعض ایسے کام کیے جو فوج کی تاریخ میں بالکل نئے تھے اس نے تین ہزار سپاہیوں میں ایک سو اٹھارہ سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ تقسیم کیا- اس نے سپاہیوں سے کہا کہ وہ ان سوالات کا جواب بلا جھجک دیں اور نیچے اپنا نام نہ لکھیں- ان میں سے بعض سوال کچھ اس قسم کے تھے-

"کیا آپ اپنے افسروں کو پسند کرتے ہیں؟"

"اگر کرتے ہیں تو کیوں؟"

"اگر نہیں کرتے تو کیا وجہ ہے؟"

"آپ کس طرح ایک اچھے سپاہی بن سکتے ہیں؟"

"ہم فوج کو کس طرح بہتر فوج بنا سکتے ہیں؟"

یہ طریق کار اس قدر غیر عمومی تھا کہ بعض پرانے افسر حیران ہو گئے اور بیزاری کے عالم میں ماتھے پر شکنیں ڈالنے لگے- لیکن اس سوالنامے کے نتائج بہترین ثابت ہوئے فوجی تربیت زیادہ آسان بنا دی گئی اور فوجیوں کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کے سلسلے میں ان کی ہمت افزائی ہونے لگی- اس تربیت کے نتائج جنگ کے دوران میں نمایاں طور پر ظاہر ہو گئے-

اگرچہ مجھے جنرل مارشل سے روبرو گفتگو کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن اس کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بیوی سے باتیں کرنے کا فخر ضرور نصیب ہے اس نے مجھے بتایا کہ جنرل مارشل بچپن ہی سے سپاہی بننے کا خواہشمند تھا۔ بچپن میں وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ سپاہیوں جیسے کھیل کھیلا کرتا تھا۔ وہ محلے کے تمام لڑکے جمع کر کے انہیں ڈرل کروایا کرتا اور پھر وہ لکڑی کے گھوڑوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے پر حملہ کیا کرتے۔

وہ ویسٹ پوائنٹ میں بھرتی ہونے کا خواہشمند تھا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اسے وہاں نہ لیا گیا۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا باپ پینل وینیا کی جمہوریہ میں ایک جنوبی ڈیمو کریٹ تھا۔ لہٰذا جنرل مارشل ریاست ورجینیا کے ورجینیا ملٹری انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہاں کا مقبول ترین اور معتبر طالب علم بن گیا۔

ایک دفعہ لڑائی کی مشق کے دوران وہ اپنے ایک ساتھی کے ہاتھوں بری طرح زخمی ہوا۔ جب ان کے انچارج آفیسر نے جنرل مارشل سے اس لڑکے کا نام پوچھا تو اس نے اس خیال کے پیش نظر کہ اس لڑکے کو سزا ہو جائے گی۔ اس کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ اس فراخدلی پر ادارے کے دوسرے لڑکے بہت خوش ہوئے اور ان کی نظروں میں جنرل مارشل کی وقعت بڑھ گئی۔

ورجینیا ملٹری انسٹی ٹیوٹ میں رہ کر جنرل مارشل نے فٹ بال کے میدان میں جو معرکے سر کیے۔ ان کی بدولت وہ ہر لڑکے کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ کالج کے پہلے تین برس میں جارج مارشل اسی قدر مصروف رہا کہ وہ فٹ بال پر ایک لمحہ بھی صرف نہ کر سکا لیکن جب وہ ہائی کلاس میں چلا گیا تو اسے تھوڑا بہت فارغ وقت ملنے لگا۔ چند ہفتوں میں اس نے فٹ بال کے متعلق مشہور کتابیں پڑھ ڈالیں اور ان کے طریقے عملی طور پر آزمانے لگے۔ اس نے اپنے کالج کی فٹ بال ٹیم اس طرح منظم کی کہ وہ ہر میچ جیتتی اور جنوبی امریکہ میں فٹ بال کی چیمپئن بن گئی' ہر ایک ایسا شخص جس نے زندگی میں پہلے کبھی فٹ بال نہ دیکھا ہو۔ اس کے لئے یہ معرکہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ فٹ بال کی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے۔

ورجینیا ملٹری انسٹی ٹیوٹ میں اس کے بہترین ریکارڈ کے پیش نظر اسے فرسٹ کیپٹن کا اعزاز دیا گیا۔ یہ اعزاز اس ادارے میں بلند ترین فوجی اعزاز تھا اور پہلی دفعہ ایک طالب علم کو ملا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

امریکی فوج کا چیف آف سٹاف ہونے کی حیثیت سے جنرل جارج' سی مارشل کو دن بھر بہت سے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ اس پر اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا کہ ایک عام آدمی پس کر رہ جاتا۔ اس کے باوجود جنرل مارشل کبھی متفکر دکھائی نہ دیا تھا۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ وہ یہ سب کچھ کس طرح کرتا تھا اس نے مجھے سات وجوہ بتائیں جن کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ جنرل مارشل کس طرح کی کسی قسم کی گھبراہٹ یا جسمانی تھکاوٹ کے بغیر ناقابل یقین حد تک کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

پہلی' اس نے کبھی لمبی لمبی رپورٹیں نہیں پڑھیں ان کے برعکس وہ مختصر مگر جامع رپورٹوں کو ترجیح دیتا تھا۔

دوسری' اس نے خود کو ہر روز مطالعے کا عادی بنا رکھا ہے اس کے علاوہ وہ جلدی فیصلہ کرنے کا عادی ہے۔ حقیقت میں وہ ہر کام جلدی جلدی کرتا ہے' جب وہ دفتر سے گھر آتا ہے اور شام کی سیر کے لئے باہر جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ تو وہ بستر پر لیٹ کر کوئی کتاب پڑھنے لگے گا اور پھر لباس بدل کر باہر نکل جائے گا۔ یہ سارا کام وہ فقط چار منٹ میں کرتا ہے۔

تیسری' ایک دفعہ کوئی فوجی فیصلہ کرنے کے بعد وہ اس پر نظرثانی کرنے کی زحمت ہرگز گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ اسے لباس عمل پہنانے کی خاطر اس پر ساری توجہ صرف کر دیتا ہے۔

چوتھی' وہ فوجی مسائل کا وسیع اور مفصل علم رکھتا ہے۔ اس کے دفتر میں دیوار سے آویزاں نقشے پر آپ کسی جگہ کوئی پن وغیرہ لگی ہوئی نہیں دیکھیں گے۔ جنرل مارشل کی فکر بے حد تیز ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ڈویژن کہاں ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔

پانچویں' وہ اپنے دن کا آغاز علی الصبح کرتا ہے۔ وہ سات بجے ناشتے سے فارغ ہو کر ساڑھے سات بجے دفتر پہنچ جاتا ہے۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا:

"تین بجے دوپہر کے بعد انسان کو کوئی منفرد خیال نہیں سوجھ سکتا۔"

چھٹی' وہ دوپہر کے وقت تھوڑی دیر آرام کر کے خود کو تازہ دم کر لیتا ہے۔ ونسٹن چرچل کی طرح وہ تھکنے سے پہلے ستا لیتا ہے۔ وہ دوپہر کا کھانا پیدل گھر کھانے آتا ہے اور اکثر اس کے ہمراہ کوئی دوسرا سینئر جنرل ہوتا ہے۔ چلنے اور کھانے کے دوران وہ دونوں تبادلہ خیالات میں مصروف رہتے ہیں۔ کھانے کے فوراً بعد جنرل مارشل اپنے مکان کے باغ میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کھلی جگہ دھوپ میں لیٹ جاتا ہے۔ اور پندرہ منٹ تک بے حس و حرکت لیٹا رہتا ہے۔ جب وہ اٹھتا ہے تو مکمل طور پر تازہ دم ہوتا ہے۔

ساتویں، چونکہ جنرل مارشل کبھی متفکر نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ بڑی مستعدی سے کام کرتا ہے، مسز مارشل نے مجھ سے کہا "جنرل مارشل سے میری شادی ہوئے تیرہ برس ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں میں نے انہیں اکثر سنجیدہ اور گنجلک مسائل پر غور کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ پریشانی کے باعث ان کی نیند میں کبھی ایک منٹ کا فرق پڑا ہو۔

جب میں نے مسز مارشل سے پوچھا کہ ان کا شوہر پریشانی سے کس طرح بچا رہتا ہے تو انہوں نے جواب دیا "دن کے اختتام پر وہ خود کو دفتر کے ہر معاملے سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ اور نہ ہی کبھی وہ دفتر کا کام گھر پر لایا ہے۔"

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ برسوں کی فوجی تنظیم کے سبب جنرل مارشل خود پر قابو پانا سیکھ گیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پریشانی اسے کام کے نااہل بنا دے گی لہٰذا وہ خود کو پریشان ہونے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ ذیل میں اس کی تنظیم نفس کی ایک مثال درج ہے۔ وہ دن میں سگریٹ کے دو تین پیکٹ پھونک دیتا لیکن چند برس پہلے اسے احساس ہوا کہ تمباکو نوشی اس کے کام کرنے کی صلاحیت پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ لہٰذا اس نے سگریٹ نوشی فوراً ترک کر دی اس دن سے آج تک اس نے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کوئی معرکہ سر کرنے سے پہلے جنرل کو اپنے آپ پر قابو ہونا بہت ضروری ہے۔ جنرل مارشل یہ دونوں کام کر سکتا ہے۔

جنرل مارشل پریشانیوں سے اس لئے بھی بچا رہتا ہے کہ وہ اپنا فارغ وقت طرح طرح کی دلچسپ مصروفیات میں گزار دیتا ہے۔ مثلاً گھڑ سواری، فلمیں دیکھنا یا اپنی بیوی کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرنا وہ ہر روز بستر میں لیٹ کر تین گھنٹے مطالعہ کرتا ہے۔

جنرل مارشل کا شوفر اکثر پبلک لائبریری جاتا ہے اور وہاں سے کئی کتابیں لے کر آتا ہے جو وہاں کے لائبریرین نے جنرل مارشل کے لئے منتخب کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کتابیں، تاریخ، سوانح حیات اور حالات حاضرہ کی ہوتی ہیں۔ جنرل کے بستر کے دونوں جانب میزوں پر کتابوں کے انبار لگے رہتے ہیں وہ بڑی تیز رفتاری سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور اکثر دو سو صفحات کی کتاب تین گھنٹوں میں ختم کر دیتا ہے۔ وہ ہر رات نیند کے غلبے سے پہلے

تک پڑھتا رہتا ہے۔ اگر رات کے وقت اس کی آنکھ کھل جائے' تو وہ بستر میں' پہلو نہیں بدلتا رہتا بلکہ بتی روشن کر کے مطالعے میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوبارہ نیند کے غلبے تک پڑھتا رہتا ہے۔

مسز مارشل نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر زندگی میں دو شخصیتوں سے بے حد متاثر ہے ایک بنجمن فرینکلن اور دوسرا رابرٹ' ای' لی' اس نے لی کی فوجی حکمت عملی کا خاص مطالعہ کیا ہے اور اس کے کردار کا بڑا مداح ہے۔ دوسری کتاب جسے وہ بار بار پڑھتا ہے وہ بنجمن فرینکلن کی سوانح حیات ہے۔

ایک دن مسز مارشل نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ اگر وہ فوجی افسر نہ بن سکتا تو اس صورت میں کیا بننے کو ترجیح دیتا' جنرل مارشل نے جواب دیا "میں کسی بڑے آرکسٹرا کا کنڈکٹر ہوتا۔"

جنرل جارج' سی مارشل اس قسم کا سپاہی ہے جس کے متعلق شیکسپیئر نے کہا تھا۔ سیزر کے پہلو میں کھڑا ہونے اور ہدایات دینے کے قابل۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مارک ٹوین

کتاب کے ایک پھٹے ہوئے ورق نے اسے دنیا کا عظیم ترین مزاح نگار بنا دیا۔

ہالی وڈ کی ایک فلم کمپنی نے چار لاکھ پونڈ خرچ کر کے امریکہ کی عظیم شخصیتوں میں سے ایک کی زندگی کے متعلق فلم بنائی ہے وہ اپنے دور کی مشہور ترین ادبی ہستی تھی اور تمام ادوار کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا مزاح نگار۔

وہ بارہ برس کی عمر تک ایک پرانے خستہ حال سکول میں تعلیم پاتا رہا۔ فقط یہی اس کی باقاعدہ تعلیم تھی۔ اس کے باوجود آکسفورڈ اور ژیل کی یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی ڈگریاں دیں اور وہاں کے بڑے بڑے عالم اس کی رفاقت کے خواہاں رہتے تھے۔ اس نے کتابیں لکھ کر لاکھوں پونڈ کمائے۔ میرے خیال میں جس قدر دولت اس نے اپنی تحریروں سے کمائی ہے۔ شاید کسی دوسرے ادیب کو نصیب ہوئی ہو' اگرچہ اسے فوت ہوئے پچاس برس سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی کتابوں' ریڈیو فیچروں اور فلموں کی رائلٹی ابھی تک اس کے لواحقین کو مل رہی ہے۔

اس ادیب کا اصل نام سیموئیل لینگھارن کلیمنز تھا۔ لیکن دنیا اسے مارک ٹوین کے نام سے جانتی ہے۔

مارک ٹوین کی ساری زندگی ایک مہم سے کم نہ تھی۔ وہ امریکی تاریخ کے رنگین اور دلچسپ دور کی پیداوار ہے وہ ایک سو پچیس برس پہلے دریائے میس سپی کے قریب ایک الگ تھلگ گاؤں میں پیدا ہوا۔ امریکہ میں پہلی ریلوے لائن کے تعارف سے سات برس پہلے۔ اس دور میں ابراہام لنکن ایک مزدور کی حیثیت سے ننگے پاؤں لکڑی کا ہل چلایا کرتا تھا۔

مارک ٹوین پچھتر ولولہ انگیز برس زندہ رہا اور پھر 1910ء میں کونیکٹی کٹ میں فوت ہوا۔ اس نے تیئس کتابیں لکھیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ بھول چکے ہیں۔ لیکن اس کی دو کتابیں "ہکل بیری فن" (Hikal Bery Fiun) اور "ٹام لیور" ادبی ہدایت

حاصل کریں گی اور جب تک انسان روئے زمین پر موجود ہے' انہیں ایک خزانہ سمجھ کر محفوظ کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ دونوں کتابیں اس کے اپنے تجربات پر مشتمل ہیں۔ یہ درحقیقت لکھی نہیں گئیں۔ بلکہ اس کے اندر سے لاوے کی طرح پھوٹ پڑی تھیں۔

مارک ٹیوین فلوریڈا میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے مکان میں پیدا ہوا آج کل کا کوئی اچھا کسان اس مکان میں اپنے مویشی باندھنے کے لئے بھی تیار نہ ہو گا۔ لیکن مارک ٹیوین نے اپنا سارا بچپن اسی مکان میں بسر کیا۔ ان دو تاریک کمروں میں آٹھ افراد رہتے تھے۔ کنبے کے سات افراد اور ایک غلام لڑکی۔ مارک ٹیوین بڑا دھان پان بچہ تھا۔ اتنا نازک اور بیمار کہ ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ وہ پہلی سردیاں بمشکل کاٹے گا۔ جوں جوں مارک ٹیوین بڑا ہوتا گیا ایک مسئلہ بنتا گیا اس کی والدہ کا کہنا ہے کہ وہ اکیلا ہی اس قدر تنگ کیا کرتا تھا کہ گھر کے دوسرے تمام بچے مل کر بھی اسے اتنی تکلیف نہ دیتے تھے۔ وہ ہر وقت علمی مذاق کی فکر میں رہتا۔ اسے سکول سے اس قدر نفرت تھی کہ اکثر گھر سے بھاگ کر دریا کی طرف جاتا۔ دریا میں چھوٹے چھوٹے جزیرے' آہستہ خرام کشتیاں اور سمندر کی طرف رواں دواں لہریں یہ سب نظارے اسے مسحور کر لیتے۔ وہ دریا کے کنارے گھنٹوں بیٹھا خواب بنتا رہتا نو دفعہ وہ دریا میں تقریباً ڈوب چلا تھا لیکن اس وقت قزاقوں کا کھیل کھیلنے' غاروں کا کھیل کھیلنے' غاروں کا کھوج لگانے' بڑے بڑے تختوں پر دریا میں تیرنے' اور فاختاؤں کے انڈے کھانے میں وہ ایسے بیش قیمت تجربات جمع کر رہا تھا جو اس کے غیر فانی کرداروں اور مناظر کی بنیاد بنے اور جنہیں اس نے اپنی دو مشہور ترین کتابوں میں محفوظ کر دیا۔

مارک ٹیوین کو اس کی حس مزاح اس کی والدہ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اس نے اپنے والد کو کبھی مسکراتے نہ دیکھا تھا لیکن اپنی والدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا "اس میں ایک ایسی صلاحیت تھی۔ جو مردوں میں تو کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتی ہے لیکن عورتوں میں بالکل مفقود ہے۔ یعنی کوئی مزاحیہ بات یہ ظاہر کئے بغیر کہہ دینا کہ وہ مزاحیہ بات ہے۔" والدہ سے ورثے میں ملی ہوئی اس صلاحیت نے مارک ٹیوین کو مقبول عام منفرد بنا دیا۔ اسی کی بدولت وہ تقریریں کر کے روپیہ کمانے کے قابل ہوا۔ اس کی والدہ اس قدر نرم دل تھی کہ مکھیاں تک نہ مارا کرتی۔ ایک دفعہ اسے مجبوراً بلی کے کچھ فالتو بچے پانی میں ڈبو کر مارنے پڑے۔ لیکن اس نے پانی کو پہلے نیم گرم کر لیا تاکہ بچے آرام سے مریں۔

مارک ٹوین کو سکول سے نفرت تھی۔ سکول اس کی آزادی میں حائل ہوتا تھا۔ وہ اسے کمرے کی چار دیواری میں محبوس رہنے پر مجبور کرتا۔ جب کہ اس کا دل جنگل میں گھومنے اور پر اسرار دریائے مینس سپی کے کنارے بیٹھنے کے لئے بیتاب ہوتا۔

جب وہ بارہ برس کا تھا تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مارک ٹوین کو سکول سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

والدہ کی وفات کے بعد مارک ٹوین کو شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ ایک نافرمان لڑکا تھا اور باپ کا کہا نہ ماننے کے جرم کے مرتکب تھا۔ بعد میں وہ بیٹا زار و قطار روتا رہتا اور اپنی گستاخی کا خود کو مورد الزام ٹھہراتا رہتا۔

اس کی ماں اسے تسلی دینے کے لئے کہتی "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تمہارے رونے سے تمہارے باپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

میں آپ سے ہر وعدہ کرنے کو تیار ہوں۔ بچے نے سسکیوں کے درمیان کہا "ماسوا ایک وعدے کے، آپ مجھے سکول جانے کے لئے نہ کہیں۔"

کچھ دنوں بعد مارک ٹوین کی والدہ نے اسے ایک واقف کار طابع کے پاس کام سیکھنے کے لئے ملازم رکھا دیا۔ دو برس اس نے کام سیکھنا تھا اور اس عرصے میں فقط اسے روٹی اور کپڑا ملنا تھا۔

دو برس بعد مارک ٹوین طابع بن گیا' ایک دن وہ ہانی بال (میسوری) کی گلیوں میں سے گزر رہا تھا کہ راستے میں اسے کسی کتاب میں سے پھٹا ہوا ایک ورق نظر آیا۔ اس نے وہ ورق یونہی دیکھنے کی خاطر اٹھا لیا۔

یہ چھوٹی سی بات اگرچہ بے حد معمولی تھی۔ لیکن اس نے مارک ٹوین کے مستقبل پر بڑے سے بڑے حادثے سے بھی زیادہ اثر کیا۔ وہ کاغذ جون آف آرک کی سوانح حیات کا ایک ورق تھا۔ اس ورق میں جون آف آرک کی روبون قلعہ کی قید کی کیفیت درج تھی۔ اس ناانصافی نے ایک چودہ سالہ لڑکے کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دی۔ وہ سوچنے لگا کہ جون آف آرک کون تھی۔ وہ اس کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ اس نے پہلے کبھی اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد اسے جون آف آرک کے متعلق جہاں کہیں سے بھی کوئی کتاب مل گئی' اس نے پڑھ ڈالی۔ بتیس برس تک وہ جون آف آرک میں دلچسپی لیتا رہا اور آخر جب وہ چھیالیس برس کا تھا تو اس نے "جون آف آرک کی یادگاریں" نامی ایک کتاب

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لکھی۔ نقادوں کے نزدیک یہ کتاب مارک ٹیوین کی اچھی کتابوں میں شمار نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اسے اپنا شاہکار سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کتاب پر اس کا نام چھپا تو لوگ اسے سنجیدگی سے نہ لیں گے اور اسی لئے اس نے یہ کتاب ایک فرضی نام سے چھپوائی۔

البرٹ بگلوپین نے مارک ٹیوین کی چار جلدوں پر مشتمل سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جون آف آرک کے بارے میں مارک ٹیوین کو وہ ورق ملنا تاریخ کے مطالعے میں اس کی دلچسپی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس ورق نے اس کے اندر ایک ایسا جذبہ بھر دیا جو اس کی فکری زندگی کا نمایاں پہلو بن گیا اور جو تادم مرگ اس کے ساتھ رہا۔ جب سے وہ آوارہ کاغذ اس کے ہاتھ آیا۔ اس کا ذہنی اور شعوری مستقبل محفوظ ہو گیا۔

مارک ٹیوین کاروبار کے متعلق ذرا قابلیت نہ رکھتا تھا۔ اس نے بڑے عجیب و غریب کاروبار میں روپیہ لگایا۔ مثلاً ایک دفعہ ایک کتاب پڑھنے کے بعد اسے یہ خیال سوجھا کہ وہ دریائے اماژون کے بالائی حصوں میں ناریل جمع اور فروخت کر کے بہت سی دولت کما سکتا ہے۔ وہ ناریل کی تجارت کے متعلق کچھ نہ جانتا تھا۔ جنوبی امریکہ جانے کے لئے اس کے پاس سفر خرچ نہ تھا۔ فرض کیا اگر وہ وہاں پہنچ جاتا تو وہاں کے باشندوں سے گفتگو کس طرح کرتا اور عین ممکن تھا کہ منطقہ حارہ کے بخار سے مر جاتا۔ لیکن ایک دن اچانک اسے راستے میں دس پونڈ کا ایک نوٹ مل گیا اور وہ فوراً دریائے اماژون کے سفر پر چل نکلا۔ ابھی وہ کنسنی نتی تک ہی گیا تھا کہ اس کا سفر خرچ ختم ہو گیا اور مجبوراً اسے اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

اپنی بعد کی زندگی میں اس نے کتابوں اور تقریروں سے بہت سا روپیہ کمایا لیکن جب بھی اس نے کسی کاروبار میں روپیہ لگایا تو وہ ناکام رہا۔ مثلاً اس نے گیس بنانے والے ایک انجن میں سرمایہ لگایا۔ لیکن وہ انجن گیس پیدا نہ کر سکا۔ پھر اس نے گھڑیال بنانے والی ایک کمپنی کھولی، مگر وہاں اسے سخت مالی نقصان ہوا۔ پھر اس نے ایک اشاعتی ادارہ کھولا مگر اس میں اسے 32000 پونڈ کا خسارہ ہوا۔ آخر اس نے ایک ایسی مشین میں بہت سا سرمایہ لگا دیا۔ جس نے حروف ٹائپ کرنے تھے..... لیکن وہ "مارک ٹیوین" سے زیادہ ٹائپ نہ کر سکی اور اسے 40000 پونڈ کا نقصان اٹھانا پڑا۔

ایک دن مارک ٹیوین کی ملاقات ایک نوجوان موجد سے ہوئی۔ اس کا نام الیگزینڈر گراہم بل تھا۔ گراہم بل نے مارک ٹیوین کو ایک نئی ایجاد "ٹیلی فون" میں سرمایہ لگانے کی

ترغیب دی۔ بل کا دعویٰ تھا کہ اس ایجاد کی بدولت اپنے گھر سے تاروں کے ذریعے سو گز دور بیٹھے آدمی سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ مارک ٹیوین اس کے اس دعوے پر خوب ہنسا۔ وہ سادہ لوح ضرور تھا مگر احمق ہرگز نہ تھا۔ تاروں کی مدد سے ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کا خیال اسے بڑا واہیات محسوس ہوا۔

اگر مارک ٹیوین نے اس وقت ٹیلی فون کے کاروبار میں ایک سو پونڈ لگا دیا ہوتا تو آج وہ لاکھوں پونڈ کا مالک ہوتا۔ لیکن اس نے ٹیلی فون کے کاروبار میں ایک سو پونڈ صرف کرنے کے بجائے یہ رقم اپنے ایک دوست کو ادھار دے دی اور تین روز بعد اس کے دوست نے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

1893ء میں جب مارک ٹیوین اٹھاون برس کا تھا۔ اس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ امریکہ ایک زبردست مالی بحران کا شکار ہو گیا۔ مارک ٹیوین کی صحت بھی ان دنوں خراب تھی۔ اگر وہ دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیتا تو آسانی سے قرض خواہوں سے بچ سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے برعکس اس نے پائی پائی چکانے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے زیادہ کتابیں لکھنے اور لیکچر دینے کا فیصلہ کیا اپنی خراب صحت اور تقریر بازی سے نفرت کے باوجود اس نے اپنی عمر عزیز کے پانچ برس دنیا کے مختلف ممالک میں تقریر کرنے اور اپنے قرض خواہوں کے لئے روپیہ جمع کرنے میں ضائع کر دیئے اس کا یہ دورہ بے حد کامیاب رہا۔ اس کی تقریریں سننے کے لئے اتنے زیادہ لوگ آتے کہ ہال وغیرہ میں سانس لینا مشکل ہو جاتا۔ جب مارک ٹیوین نے اپنے قرض کی آخری پائی تک چکا دی تو اس نے کہا۔ اب مجھے پھر ذہنی سکون کی دولت مل گئی ہے۔ کام اب پھر خوشگوار محسوس ہوتا تھا۔ اب یہ میرے لئے مشقت نہیں رہا۔"

کاروبار کے برعکس محبت کے معاملے میں مارک ٹیوین زیادہ خوش قسمت تھا۔ جس لڑکی سے اس نے شادی کی' اسے دیکھنے سے پہلے اس کی تصویر دیکھ کر اس کے دام عشق میں گرفتار ہو گیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ایک جہاز میں "مقدس سرزمین" کی سیر کے لئے جا رہا تھا۔

ایک دن وہ اپنے ایک دوست چارلس لینگڈون کے کیبن میں گیا وہاں اسے لینگڈون کی بہن کی تصویر دکھائی دی۔ خوبصورت اولیویا لینگڈون کی تصویر' اسے ایک دم محسوس ہونے لگا کہ وہ اس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ بار بار اپنے دوست کی کیبن میں جاتا اور

کتنی دیر تک وہ مسحور کن تصویر دیکھتا رہتا اور ہر دفعہ اس کا اس سے شادی کرنے کا خیال زیادہ پختہ ہو جاتا۔

چند ماہ بعد نیویارک میں ایک ڈنر پر مارک ٹیوین کی ملاقات اولیویا لینگڈن سے ہوئی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مارک ٹیوین نے لکھا ہے "پہلی ملاقات سے اب تک وہ میرے ذہن سے لمحہ بھر کے لئے دور نہیں ہوئی۔" چند روز بعد اولیویا لینگڈن کے والد نے مارک ٹیوین کو اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہاں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو مارک ٹیوین کا دل جانے کو نہ چاہتا تھا اس نے لینگڈن کے کوچوان سے درخواست کی کہ وہ گاڑی کی پچھلی نشست کچھ اس طرح جمائے کہ مارک ٹیوین کے بیٹھتے ہی وہ باہر سڑک پر گر پڑے۔ پھر ہاتھ وغیرہ ملانے کے بعد مارک ٹیوین گاڑی میں آ بیٹھا اور ابھی گھوڑے چند قدم ہی گئے تھے کہ مارک ٹیوین ایک ہچکولے سے دھڑام سے سڑک پر آ گرا۔ اس نے سڑک پر گرتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اسے اٹھا کر دوبارہ لینگڈن کے گھر لایا گیا اور وہ دو ہفتے چوٹوں کا بہانہ کر کے ان کے گھر رہا۔ اس دوران میں اس کی محبوبہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ وہ مارک ٹیوین کو "پیارے یوتھ" کہا کرتی اور مارک ٹیوین اسے "پیاری لیوی" خطاب کرتا۔ جب تک وہ دونوں اکٹھے زندہ رہے ایک دوسرے کو اسی نام سے پکارتے رہے لیوی نے اس کے محبت نامے ایک بنک میں جمع کرا رکھے تھے۔ اور سال کے سال چھٹیوں کے دنوں میں انہیں نکلوا کر پڑھا کرتی تھی۔

مارک ٹیوین کے تمام مسودوں پر اس کی بیوی نظر ثانی کرتی تھی۔ رات کے وقت وہ اپنی تمام تحریریں گھر لے جاتا اور انہیں بیوی کے بستر کے قریب ایک میز پر رکھ دیتا۔ وہ ہر تحریر کو بڑے غور سے پڑھتی اور فالتو الفاظ بلا جھجک کاٹ دیتی مارک ٹیوین اس کی ہر تبدیلی بلا چون و چرا قبول کر لیتا اور کبھی کوئی دلیل پیش نہ کرتا۔

اسے اپنے مسودوں کے کھو جانے کا اس قدر خوف لگا رہتا تھا کہ ملازمہ کو کمرہ صاف کرتے وقت اس کے میز کے قریب آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی وہ میز کے قریب فرش پر ایک لکیر کھینچ دیتا۔ ملازمہ اس سے آگے نہ جا سکتی تھی۔

جب مارک ٹیوین ستر برس کا ہوا تو اس نے سوچا اب وہ اتنی عمر کا ہو چکا ہے کہ من مانی کر سکے۔ لہٰذا اس نے چودہ سفید سوٹ اور ایک سو سفید ٹائیاں خریدیں اور فیصلہ کیا کہ اب وہ باقی زندگی فقط سفید لباس پہنے گا۔ اس نے شب خوابی کا لباس بھی سفید سلوا لیا۔

1835ء میں جب کہ مارک ٹیوین پیدا ہوا تھا۔ آسمان پر ہیلی نامی دمدار ستارہ دکھائی دیا تھا۔ یہ ہر پچھتر برس بعد دکھائی دیتا ہے اور مارک ٹیوین کی خواہش تھی کہ وہ اسے دوبارہ دیکھ کر مرے اور ایسا ہی ہوا۔ 1910ء کی ایک شب کو جب وہ ستارہ دوبارہ نمودار ہوا تو اسے دیکھ کر اسی شب مارک ٹیوین دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ذیل میں چار سطریں ایسی ہیں جو مارک ٹیوین نے اپنی لڑکی سوسی کی وفات کے بعد اس کے کتبے پر کندہ کرائی تھیں۔ یہ چار سطریں جنہیں امریکی قوم کو بھی اس کے کتبے پر کندہ کرانی چاہیے تھیں۔

موسم گرما کے گرم سورج! یہاں نرمی سے چمک۔
جنوبی گرم ہوا! یہاں آہستہ چل۔
گھاس والی مٹی! بوجھ یہاں زیادہ نہ ڈال۔
میرے معصوم دل! خدا حافظ، خدا حافظ۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل چارلس و نگیٹ

اس نے جنگ کے جدید نظریئے میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

میجر جنرل چارلس و نگیٹ کا شمار ان بہترین فوجی رہنماؤں میں ہوتا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں ایشیا کے جنگلوں میں جاپانیوں کے خلاف لڑے۔ 1943ء میں جبکہ و نگیٹ فقط 39 برس کا تھا۔ وہ چند ہزار برطانوی سپاہیوں کو ہندوستان کے راستے برما میں لے گیا اور وہاں اس نے جاپانی سپاہیوں کی صفیں چیر دیں۔ پھر تین ماہ تک و نگیٹ اور اس کے ساتھی جاپانیوں کی رسد کی راہیں کاٹتے۔ ان کے اسلحہ خانوں کو تباہ کرتے۔ ان کے ہوائی اڈوں پر دھاوا بولتے اور ریلوں اور ریلوے لائنوں کو توڑتے رہے۔ جاپانی حیران رہ گئے اور بے حد گھبرا گئے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اگر چیونٹیوں کے ہجوم کو ذرا سا چھیڑ دیا جائے تو وہ افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگتی ہیں یہی حالت جاپانیوں کی تھی۔ و نگیٹ کے حملہ آور سپاہی بالکل غیر متوقع جگہوں پر حملے کرتے تھے۔ جاپانیوں کی تعداد ان سے دس گنا زیادہ تھی۔ اگر انہیں اپنے دشمن کا پتہ چل جاتا تو اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیتے لیکن و نگیٹ کے آدمی مختلف گروہوں میں بٹ کر جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ لہٰذا انہیں دس ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے گھنے جنگل میں تلاش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

جنرل و نگیٹ اور اس کے "حملہ آوروں" نے چار نہایت اہم کام انجام دیئے۔

پہلا' انہوں نے جاپانیوں کو برما میں اپنے ذرائع آمدورفت کے تحفظ میں اس قدر مشغول رکھا کہ انہیں چین یا ہندوستان پر حملہ کرنے کا وقت ہی نہ ملا۔

دوسرا' اپنے حملوں سے انہوں نے بڑی اہم معلومات فراہم کیں جن کی مدد سے رائل ایئر فورس کے لئے برما میں جاپانی مقبوضہ علاقے پر موثر حملے کرنا آسان ہو گیا۔

تیسرا' انہوں نے ثابت کر دیا کہ مناسب تربیت کے ساتھ دوسرے درجے کے فوجی جیسے کہ و نگیٹ کے پاس موجود تھے اور جنہوں نے اپنی زیادہ زندگی برطانیہ کے کارخانوں یا دوکانوں میں بسر کی تھی۔ جاپانیوں کے لئے دردسر بن سکتے تھے۔

چوتھا' انہوں نے بعض ایسے طریقے اختیار کیے جنہیں بار بار استعمال کر کے وہ ان کے ماہر ہو گئے اور ان کی مدد سے آخرکار وہ جاپانیوں کو برما کے جنگلات سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے باوجود جب جنرل ونگیٹ نے پہلے پہل جنگل میں جنگ کا آغاز کرنے کا انقلابی خیال پیش کیا تو بعض زیادہ قدامت پسند افسروں نے کہا کہ یہ خیال اصلی جنگ کے بجائے ہالی وڈ کی کسی فلمی کہانی کا مرکزی خیال معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی قسم کے ذرائع آمدورفت کے بغیر وہاں کیسے جنگ چھیڑی جا سکتی تھی۔ بعض نے اسے خودکشی قرار دیا۔ ونگیٹ نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور اس نے جنگ کے جدید نظریئے میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

ونگیٹ نے 1942ء کے موسم گرما میں ہندوستان کی جلا دینے والی دھوپ میں اپنے آدمیوں کو تربیت دی۔ اس نے انہیں ٹارزن کی نقل کرنے کے لئے کہا' اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

1943ء میں وہ برما کے جنگلات میں گھس گئے ان کے پاس نئے اور پرانے ذرائع آمدورفت تھے۔ گھوڑا' گاڑیوں' ہاتھیوں' خچرو اور بیلوں کے ساتھ ساتھ سپلائی وغیرہ حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس ہوائی جہاز بھی تھے۔

ونگیٹ کے حیران کن سپاہی گھنے جنگلوں' پرپیچ راستوں اور دشوار گزار پہاڑی چوٹیوں سے گزرتے رہے۔ بعض ایسے راستے بھی تھے جہاں اگر انسان کا پاؤں پھسل جائے تو سیدھا موت کے منہ میں چلا جائے۔ ایک ہاتھی اور ایک خچر کا یہی انجام ہوا۔ کبھی کبھی انہیں راستے میں انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہ ڈھانچے جنرل سٹل ول کے ان سپاہیوں میں سے بعض کے بچے کھچے حصے تھے جو گذشتہ موسم گرما میں اسی راستے سے پسپا ہوئے تھے۔

انہوں نے ہاتھیوں پر مشین گنیں۔ فولڈنگ کشتیاں اور ریڈیو سیٹ لاد رکھے تھے۔ بیل گاڑیاں' اسلحہ اور بارود سے بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے آٹھ قطاریں بنا رکھی تھیں۔ گورکھا اور بری فوجوں کی قطاریں' انگریز سپاہی' ہاتھی' کتوں' بیلوں اور خچروں کی قطاریں۔ ہر قطار ایک میل لمبی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ جلوس کی شکل میں حضرت نوحؑ کی کشتی کی طرف جا رہے ہوں۔ لیکن ان کی حرکت کی آواز دو سو گز دور بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ کیونکہ گھنا جنگل ان کی آوازیں دبا دیتا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

سخت گیری کے باوجود ونگیٹ کے آدمی ایک دن میں تیس میل طے کر لیتے تھے ونگیٹ اس عجیب و غریب نظریئے کا قائل تھا کہ مسلسل چلنے سے آدمی بخار کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آدمیوں کو شیو کرنے کی اجازت بھی نہ دیتا اس کا خیال تھا کہ اس طرح دس منٹ ضائع ہو جاتے ہیں۔

ہر قطار کے آگے آگے جاسوس کتے چلتے تھے جس طرح بعض کتوں کو لومڑی یا دوسرے جانوروں کی بو پہچاننے کی تربیت دی جاتی ہے اسی طرح ان کتوں کو جاپانیوں کو بو پہچاننے کی تربیت دی گئی تھی۔

ہر سپاہی کے پاس اتنی غذا ہوتی کہ چھ دن تک چل سکے۔ اس کے بعد ہوائی جہاز انہیں مزید رسد پہنچا دیتے۔ وہ ریڈیو کے ذریعے مخصوص الفاظ میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو پیغام بھیجتے اور وہ جگہ بتا دیتے جہاں ہوائی جہازوں سے رسد پھینکی جائے۔ یہ جگہیں عموماً دریاؤں کے خشک پاٹ، چاولوں کے کھیت اور گھاس کے میدان ہوتے تھے۔ انہوں نے اس سارے عرصہ میں ہوائی جہازوں کے ذریعے پانچ لاکھ ٹن اشیائے خوردنی حاصل کیں۔

ونگیٹ کے آدمی جس چیز کی بھی خواہش کرتے ہندوستان میں قائم فوجی ہیڈ کوارٹر اس کا احترام کرتا۔ ایک دفعہ سامان رسد میں سے مصنوعی دانت اور برنارڈشا کی سوانح حیات بھی نکلی۔ ایک افسر جس کی فوجوں کو جاپانیوں نے گھیر لیا تھا اس نے ریڈیو کے ذریعے ہیڈ کوارٹر کو درخواست کی کہ اسے ایک وصیت نامہ ارسال کیا جائے۔ وہ وصیت نامہ اسے پہنچایا گیا۔ ایک دفعہ ونگیٹ کے آدمیوں نے چاکلیٹ کی خواہش ظاہر کی اور انہیں چار سو پونڈ چاکلیٹ پہنچائی گئی۔ اگرچہ کلکتہ کے ایک ہوٹل کو اتنی بڑی مقدار میں چاکلیٹ تیار کرنے کے لئے ساری رات کام کرنا پڑا۔

ہندوستان میں سامان رسد کا انچارج کیپٹن لارڈ تھا۔ ایک دفعہ ونگیٹ نے اسے یہ ریڈیائی پیغام ارسال کیا۔ "اوہ لارڈ (خدا) ہمیں روٹی بھیج۔" اسی وقت واپسی جواب آیا "لارڈ (خدا) نے تمہاری دعا قبول کر لی ہے" چند گھنٹوں کے بعد ہوائی جہازوں نے انہیں ضروری اشیائے خوردنی پہنچا دیں۔

دشمن کے علاقے میں تین سو میل تک بڑھنے، ایک ہزار جاپانیوں کو ہلاک کرنے ان کے رسد کے راستے اور اہم فوجی اڈے تباہ کرنے کے بعد آخرکار ونگیٹ نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ فوج کی ایک قدیم کہاوت ہے۔ لڑنے کے لئے جمع ہو جائیں اور زندہ

رہنے کے لئے بکھر جائیں۔" ان کا مقصد حل ہو چکا تھا۔ لہٰذا ونگیٹ کے آدمی منتشر ہو کر چالیس چالیس کے گروہ میں چلنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ بھاری سامان اور خچروں اور بیلوں کے ساتھ واپس ہوئے' تو ان کی رفتار بے حد مدھم ہو گئی۔ لہٰذا انہوں نے اپنا بھاری سامان زمین کھود کر اس میں دفن کر دیا۔ خچروں اور بیلوں کو ذبح کر کے کھا گئے اور بڑی تیز رفتاری سے واپس ہندوستان چل پڑے۔ چونکہ اب ان کے پاس ریڈیو نہیں تھے۔ لہٰذا رسد حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات بھوک انہیں اس قدر تنگ کرتی کہ وہ سانپ اور گدھ وغیرہ کھا جاتے۔ وہ گھاس کو ابال کر اس کا شوربہ پیتے ہر آدمی کا وزن پندرہ پونڈ گھٹ گیا۔ جاپانی پانی کے ذخیروں پر ان کے گھات میں بیٹھے رہتے تھے۔ لہٰذا وہ بانس توڑ کر اس میں سے جو چند گھونٹ پانی نکلتا' اسی پر اکتفا کرتے۔

جب ونگیٹ اور اس کے آدمی مئی 1943ء میں واپس ہندوستان پہنچے تو بڑے اہتمام سے ان کا استقبال کیا گیا۔ ونگیٹ کو "لارنس آف برما" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

ونگیٹ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہمالیہ کے دامن میں۔ اس کا والد فوج میں بتیس برس ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر ہندوستان میں مذہبی پرچار کرنے لگا تھا۔ ونگیٹ بھی قدرے مذہبی واقع ہوا تھا۔ وہ ہر مشکل اور دشوار مہم کا آغاز دعا اور انجیل کے بعض ابواب کے مطالعے سے کرتا وہ سگریٹ ہرگز نہ پیتا۔ لیکن پیاز بڑی رغبت سے کھاتا' چلتے وقت بھی وہ پیاز کھاتا رہتا۔

وہ مطالعے کا بے حد شوقین تھا اس کا حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ اسے فرعون مصر سے اب تک کے تمام عظیم جرنیلوں کے حالات زندگی ازبر تھے وہ شیکسپیئر فلسفے اور مذہبی تاریخ کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا۔ اسے ایک انسائیکلو پیڈیا سمجھا جاتا۔ وہ چند زبانیں بول اور عربی میں گا سکتا تھا۔

ایک دفعہ ایک گوریلہ حملے کی تیاری کے وقت وہ سارا دن کلاک ہاتھ میں لئے پھرتا اور سپاہیوں کو یہ یاد دلاتا رہا کہ ہر لمحہ بے حد قیمتی ہے اور کوئی اسے ضائع نہ کرے۔

وہ اپنے افسران بالا کو ان کے منہ پر ان کی غلطیاں بتا کر اکثر برطانوی فوجی قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو جاتا۔ شاید وہ موجودہ دور کا پہلا فوجی افسر ہے جس نے اپنے ایک سینئر افسر کی شکایت بلا واسطہ شہنشاہ انگلستان سے کر دی بادشاہ نے تحقیق کے لئے ایک کمیٹی قائم کی اور ونگیٹ نے اعلیٰ فوجی خدمات انجام نہ دی ہوتیں تو اسے اسی وقت ملازمت سے

برطرف کر دیا جاتا۔ و نگیٹ نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ "میں اس اسے نصف بھی پاگل نہیں۔ جتنا لوگ مجھے خیال کرتے ہیں۔"

کم از کم ونسٹن چرچل اسے ہرگز خبطی خیال نہ کرتا تھا۔ برما کی شاندار مہم سے واپسی کے بعد چرچل نے اسے "کیوبک کانفرنس" میں شرکت کی دعوت دی۔ وہاں چرچل، و نگیٹ اور دوسرے فوجی افسروں نے شمالی برما میں جاپانیوں کو پسپا کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

میجر، جنرل چارلس و نگیٹ 24۔ مارچ 1944ء کو ہندوستان کی سرحد کے قریب ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آدمیوں کو جس طرح تربیت دی تھی۔ وہ فوجی تاریخ میں ایک روایت بن گئی ہے۔

برطانوی فوجی تاریخ میں و نگیٹ کا نام کلائیو، لارنس آف عریبیا اور دوسری لاثانی شخصیتوں کے دوش بدوش زندہ رہے گا، اس کی زندگی اس مقولے کی ایک زندہ مثال تھی "تجھے جو کام کرنے کے لئے کہا جائے، اسے پوری تن دہی سے کر۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جیک ڈیمپسی

اس نے چار منٹ کا معاوضہ 100,000 پونڈ حاصل کیا۔

ایک دفعہ مجھے ایک شخص کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا جسے ایک دفعہ 400 پونڈ فی سیکنڈ کے حساب سے اپنے کام کا معاوضہ ملا۔ اس نے چار منٹ میں 100'000 پونڈ کمائے اس کا نام جیک ڈیمپسی تھا۔ جیک ڈیمپسی کی حیثیت انسان سے بلند ہے۔ وہ ایک روایت بن چکا ہے۔

میں نے اس کے ہمراہ ریاست ہائے امریکہ متحدہ کے ساحلی محافظ دستوں کے ہیڈ کوارٹرز میں کھانا کھایا تھا۔ جہاں وہ لیفٹیننٹ کمانڈر کی حیثیت سے لاکھوں آدمیوں کو مکہ بازی اور پہلوانی کی تربیت دے رہا تھا۔

جنگ کے ابتدائی دور میں جیک ڈیمپسی کی ہردل عزیزی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک اخبار نے یہ داستان شائع کی کہ جیک ڈیمپسی کس طرح کام کر رہا ہے۔ وہ کہانی ہفتے کی شام کو ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ جب کہ مقامی بھرتی کا دفتر بند ہو چکا تھا' اگلا دن اتوار تھا۔ لیکن تقریباً اڑھائی سو نوجوان بھرتی کے دفتر کے سامنے اپنا نام لکھوانے کے لئے جمع ہو گئے۔ اخبار کے ایڈیٹر کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے متعلقہ افسروں کو ٹیلی فون کیا اور ان لوگوں کے نام درج کرنے کے لئے خاص طور پر دفتر کھولا گیا۔ وہ سب لوگ جیک ڈیمپسی کے تحت تربیت حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

جیک ڈیمپسی نے مجھے بتایا کہ اس کی زندگی کے سب سے زیادہ بے رنگ ایام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب وہ باکسنگ میں "جس ویلرڈ" کو شکست دے کر دنیا کا ہیوی ویٹ چیمپئن بنا تھا۔

تب اسے وہ بات معلوم ہوئی جو اس سے پہلے کئی لوگ معلوم کر چکے ہیں یعنی کسی چیز کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں اسے پا لینے کی نسبت زیادہ مزا ہوتا ہے۔

جس دن وہ چیمپئن بنا اس کی ساری زندگی ہی بدل گئی۔ ڈرامائی تیزی سے وہ ایک ایسی

دنیا میں داخل ہو گیا۔ جس کے لئے اس نے خود کو تیار نہ کیا تھا۔ اخباروں کے رپورٹر' فوٹو گرافر' آٹو گراف لینے والے اور سیلزمین اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اس کے بہت سے پرانے دوست اس سے روپیہ ادھار لینے کے لئے اس کے مکان پر جمع رہنے لگے۔ اسے اخباروں اور رسالوں میں مضمون لکھنے' سٹیج پر آنے' تقریریں کرنے' دواؤں وغیرہ کے اشتہار پر اپنا نام دینے اور نیک کاموں کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم میں شامل ہونے کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ ہالی وڈ کی ایک فلم کمپنی نے اس کے ساتھ ایک فلم کا معاہدہ کر کے اسے اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ امریکہ اور برطانیہ کی بڑی بڑی شخصیتیں اسے اپنے یہاں مدعو کرتیں' بڑے بڑے عالم اسے اپنے گھر لاتے۔ یہ عالم گفتگو میں ایسے الفاظ استعمال کرتے جو اس کے سر پر سے۔۔۔۔ گذر جاتے' اور جو اسے اپنے عجیب و غریب سوالات سے پریشان کر دیتے۔

"میں بچپن میں ایک خچر پر بیٹھ کر سکول جایا کرتا تھا" جیک ڈیمپسی نے مجھے اپنی کہانی سنانے کے دوران..... کہا۔ "مجھے تعلیم میں ذرا دلچسپی نہ تھی۔ اسی لئے میں نے بہت تھوڑی تعلیم حاصل کی۔ لہٰذا مجھے ان علماء کی باتیں اپنی سمجھ سے بعید معلوم ہوتی تھیں۔"

لوگ اس طرح جیک ڈیمپسی کے تعاقب میں رہتے کہ وہ آرام سے کھانا بھی نہ کھا سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں کھانا لانے کا آرڈر دیتا تو بھی چھ بیرے اس کا کھانا لے کر آتے اور وہ اس کے قریب کھڑے ہو کر کھانے کے دوران اسے گھورتے رہتے۔

جب وہ انگلینڈ پہنچا تو ملکہ میری نے بکنگھم پیلس میں اسے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جیک ڈیمپسی اس قدر گھبرا گیا کہ اس نے بیماری کا بہانہ کر کے یہ حکم ٹال دیا۔ تاریخ میں شاید وہ واحد شخص ہے۔ جس نے کبھی بکنگھم پیلس کی حکم عدولی کی ہو۔ وہ واقعی بیمار تھا۔ اسے گھبراہٹ' تفکرات اور ذمہ داریوں کا بخار چڑھا ہوا تھا۔

جیک ڈیمپسی نے 4۔ جولائی 1919ء میں جس ویلرڈ سے ہیوی ویٹ چیمپئن شپ جیتی تھی۔ جیت کے بعد اس کا جو شاندار استقبال ہوا۔ اس سے رات گئے فارغ ہو کر جب وہ بستر پر لیٹا' تو اس نے ایک بڑا پریشان کن خواب دیکھا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ہار گیا ہے۔ خواب اس قدر واضح اور حقیقی تھا کہ وہ ایک دم لباس بدل کر کے اخبار خریدنے کے لئے رات کے تین بجے باہر گلی میں نکل گیا۔ "میں نے ایک اخبار فروش لڑکے سے پوچھا کہ کون جیتا تھا۔"

جیک نے کہا۔

"ڈیمپسی جیت گیا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔ "کہیں آپ ڈیمپسی تو نہیں؟"
جیک گھبراہٹ کے عالم میں ہنسنے لگا۔ اور اس نے اعتراف کر لیا کہ وہی ڈیمپسی ہے۔
"تو پھر آپ کو بھی معلوم نہیں کہ مقابلہ کون جیتا ہے۔" لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔
اگر اس اخبار فروش لڑکے کو یہ معلوم ہو جاتا کہ جیک ڈیمپسی ایک خواب سے پریشان ہو کر اپنی جیت کے متعلق وسوسے میں پڑ گیا ہے تو وہ مزید حیران ہوتا۔

ڈیمپسی نے مجھے بتایا کہ اگر وہ اپنے افلاس پر ضرورت سے زیادہ نادم نہ ہوتا تو وہ کبھی پیشہ ور مکہ باز نہ بن سکتا۔ اس کا والد ایک بے نیاز مستانہ تھا جسے بانسری بجانے کا جنون تھا اور جو ایک جگہ جم کر نہ بیٹھتا تھا۔ وہ ہر وقت کسی تازہ معرکے کی تلاش میں رہتا تھا۔

ایک دن اس نے گھر کا سارا سامان اور اپنے گیارہ بچے گھوڑا گاڑی میں لادے اور کولوریڈو کے بلند پہاڑوں کی سمت چل پڑا۔ جب وہ دس ہزار فٹ بلند ایک وادی میں پہنچے تو وہاں سخت سردی تھی۔ تھکاوٹ سے ایک گھوڑا مر گیا۔ جیک کی والدہ بھی موت کے خطرے کی زد میں آ گئی۔ سردی سے اس کے بدن میں درد ہونے لگا۔ اس کا شوہر اسے جلد از جلد اتنی بلند جگہ سے نیچے لانا چاہتا تھا۔ اس نے ریلوے کا ٹکٹ خرید کر اسے ڈینور جانے والی گاڑی میں بٹھا دیا جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔ وہ جیک کو اس خیال کے تحت اپنے ساتھ لے گئی کہ اس کی ٹکٹ نہیں لگے گی۔ لیکن اس وقت جیک آٹھ برس کا تھا۔ راستے میں ٹکٹ چیکر آ گیا اور اس نے قسم کھائی کہ وہ جیک کی ماں سے اس کا نصف کرایہ وصول کر کے رہے گا ورنہ اسے ٹرین سے اتار دے گا۔ جیک کی والدہ نے اس سے التجا کی کہ وہ بیمار ہے اور اس کے پاس اپنے بیٹے کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں۔ لیکن ٹکٹ چیکر اس کی ہر بات ان سنی کر رہا تھا۔ آخر پریشان ماں رونے لگی۔

ڈبے میں ایک "کاؤ بوائے" بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے جیک کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "بیٹے! اپنی امی سے کہو کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا کرایہ میں ادا کئے دیتا ہوں۔"

"مجھے اپنے غریب ہونے پر بے حد شرم محسوس ہوئی۔" جیک ڈیمپسی نے کہا۔
"میں نے تہیہ کر لیا کہ بڑا ہو کر میں لوگوں کو اس بات کی ہرگز اجازت نہ دوں گا کہ وہ میری بے عزتی کریں اور مجھے ٹرین سے اتر جانے کا حکم دیں۔ اپنی والدہ کو ہر ایک کے سامنے روتا ہوا دیکھ کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے اسی وقت ایک عظیم باکسر بننے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اور روپیہ جمع کرنے کا تہیہ کر لیا۔"

جیک ڈیمپسی نے اپنے کتے جیسا عظیم لڑاکا بننے کا فیصلہ کر لیا۔ جیک نے ایک بل ڈاگ نسل کا کتا پال رکھا تھا۔ اس کتے نے کبھی حفاظتی لڑائی نہ لڑی تھی۔ اس نے کبھی اس بات کی پروا نہ کی تھی کہ دوسرا کتا اس کی پسلی توڑ رہا ہے وہ ایک حملہ آور کتا تھا۔ جیک نے کہا۔ "میں نے بھی اس جیسا بننے کی کوشش کی ہے میرے ہونٹ پھٹ جاتے' آنکھیں سوج جاتیں اور پسلیاں ٹوٹ جاتیں لیکن میں کبھی پروا نہ کرتا۔ مجھے آج تک فقط ایک ضرب کا احساس ہوا ہے۔ یہ جون لسٹر جونسن کا ایک مکہ تھا جس نے میری تین پسلیاں توڑ دی تھیں۔ اس کے سوا میں نے کبھی کسی دوسری جانب پر دوسری بار سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔" باکسنگ رنگ میں بار بار اپنے آپ سے کہتا رہتا "مجھے کوئی روک نہیں سکتا کوئی مجھے زخمی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے حریف پر اندھا دھند حملے کرتا رہوں گا۔ انجام خواہ کچھ بھی ہو۔"

جیک ڈیمپسی نے لوئس فرپو کے ساتھ اپنے مقابلے کے بارے میں مجھے چند حیرت ناک باتیں بھی بتائیں۔ لوئس فرپو جسے "پمپاس کا جنگلی بیل" کہا جاتا تھا۔

سپورٹس کی تاریخ میں اس سے زیادہ ولولہ انگیز اور دل کی حرکت بند کر دینے والا مقابلہ آج تک نہیں ہوا بے پناہ ہجوم پاگلوں کی طرح اچھل اور چلا رہا تھا۔ اور ستر ہزار تماشائی دو لاکھ پونڈ خرچ کر کے یہ مقابلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہ مقابلہ فقط چار منٹ جاری رہا۔ لیکن یہ چار منٹ اپنے اندر ایک عجیب نظارہ لئے ہوئے تھے پہلے راؤنڈ میں سات "ناک ڈاؤن" ہوئے۔ رنگ کے قریب بیٹھے ہوئے کھاگ کھلاڑی آج تک اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ دونوں حریفوں میں کون کتنی بار گرا تھا۔

ڈیمپسی نے مجھے بتایا کہ اس مشہور مقابلے میں کیا ہوا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے فرپو کو چند مرتبہ مار گرایا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ فرپو نے ایک دفعہ مکہ مار کر اسے رنگ سے باہر پھینک دیا تھا اور اس نے ایک ٹائپ رائٹر پر گر کر اسے توڑ دیا تھا۔

یہ مقابلہ دوسرے راؤنڈ میں ختم ہو گیا لیکن ڈیمپسی نے کہا کہ جب وہ واپس ڈریسنگ روم میں گیا تو اسے یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ مقابلہ دو راؤنڈ ہو رہا ہے یا دس راؤنڈ یا بیس راؤنڈ۔

یہی وہ مقابلہ ہے جس میں اسے 400 پونڈ فی سیکنڈ کے حساب سے ملے اور یہ مقابلہ 237 سیکنڈ جاری رہا۔

تمام بڑے کھلاڑی خود میں دو خوبیاں پیدا کرنے پر بے حد توجہ صرف کرتے ہیں کسی بات پر پوری توجہ دینے کی صلاحیت اور وہ کام خود بخود کئے جانے کی صلاحیت۔ ڈیمپسی نے بتایا کہ "مقابلے کے وقت وہ مقابلے پر اس قدر توجہ دیتا کہ اسے ہجوم کا شور و غل بالکل سنائی نہ دیتا اور اس کے ہاتھ یوں حرکت کرتے کہ بعض اوقات اسے خود بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اگر آپ یہ سوچنے کے لئے رک جائیں کہ اب کیا کرنا ہے تو اتنے میں گاڑی نکل جاتی ہے۔"

"اپنے مقابلے کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کے لئے میں اخبار پڑھا کرتا تھا۔" اس نے بات جاری رکھی۔ "جب میں کسی حریف کو مار گراتا تو مجھے ہرگز معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کس قسم کی ضرب سے گرا تھا۔ حقیقت میں بعض دفعہ مجھے یہ بھی علم نہ ہوتا تھا کہ میرا حریف گر پڑا ہے حتیٰ کہ ریفری مجھے بتاتا اور جب میں نے شکست کھائی تھی۔ تو مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کس طرح ہارا تھا۔"

جیک ڈیمپسی نے دس برس کی عمر ہی سے مکا بازی کے بڑے مقابلے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے ایک ویران مرغی خانے کو اپنی تربیت گاہ بنا رکھا تھا۔ اس نے گرنے کے لئے فرش پر ایک چٹائی بچھائی اور ایک بورے میں ریت اور بورا بھر کر اس پر مکا بازی کی مشق کرنے لگا۔

جب 4_ جولائی 1910ء کو جم جیفری اور جیک جونسن کے درمیان ہیوی ویٹ چیمپئن شپ کے مقابلے کا اعلان ہوا تو اس وقت ڈیمپسی پندرہ برس کا تھا لیکن اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "جو شخص یہ مقابلہ جیتے گا' ایک روز میں اسے شکست دے کر رہوں گا۔" اس نے ایک چاک لے کر اپنی مشق کی بوری کے ایک طرف جم جیفری اور دوسری طرف جیک جونسن کی تصویر بنا دی۔ کئی دن وہ دونوں پر مکے برساتا رہا جب جیک جونسن نے مقابلہ جیت لیا تو ڈیمپسی نے جم جیفری کی تصویر مٹا کر اس طرف بھی جیک جونسن کی تصویر بنا دی اور اس پر مکا بازی کی مشق جاری رکھی۔

نو برس بعد جیک ڈیمپسی نے جیک جونسن کو شکست دینے والے کو شکست دے کر ہیوی ویٹ باکسنگ چیمپئن شپ حاصل کر لی۔

4- جولائی 1919ء کو جس روز اس نے یہ مقابلہ جیتا۔ اس وقت اس کا والد سالٹ ایک نامی شہر میں رہتا تھا۔ سالٹ لیک کے ایک اخبار نے اسے اپنے دفتر مدعو کرکے اسے مقابلہ کی تازہ تازہ خبریں سنانے کے لئے کہا۔ اخبار کے دفتر کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ جیک ڈیمپسی کا والد اس کے مقابلے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرے، اس نے ایک بالکونی پر نمودار ہو کر لوگوں سے کہا کہ اس کا بیٹا چار راؤنڈ سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکے گا۔ کیونکہ جس ویلرڈ اس سے کہیں زیادہ برتر ہے۔

لیکن جب جیک ڈیمپسی کی فتح کی خبر تاروں کے ذریعے وہاں پہنچی تو اس کا باپ بھاگا بھاگا بالکونی میں آیا اور چلا کر لوگوں سے کہنے لگا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ میرا بیٹا جیتے گا۔ میں تو تم سے پہلے ہی یہی کہتا تھا۔"

کسی مقابلے کی مشق کے دوران..... جیک ڈیمپسی دن میں کئی کئی دفعہ عبادت کرتا مقابلے کی گھنٹی بجنے سے پہلے بھی وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا اس طرح اسے مقابلے کو اعتماد اور جرات سے آغاز کرنے میں مدد ملتی۔

"دعا مانگے بغیر میں نے زندگی میں نہ تو کبھی کھانا کھایا ہے اور نہ ہی کبھی سویا ہوں" اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ میری دعائیں ہزار مرتبہ قبول ہوئی ہیں۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ونسٹن چرچل

اسے ریاضی سے نفرت تھی اس کے باوجود وہ چار برس تک وزیر مال رہا۔

میں عمر بھر اس حقیقت سے متاثر ہوتا رہا ہوں کہ بعض اوقات معمولی واقعات تاریخ میں کایا پلٹ حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں خانہ جنگی سے چار برس پہلے 1857ء کی افراتفری میں لیونارڈو جیرم نامی ایک شخص نے وال سٹریٹ کے سٹہ بازار میں بارہ لاکھ پونڈ کمائے۔ ظاہر ہے لیونارڈو جیرم کے سوا اس واقعہ میں کسے دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن اب اس واقعہ پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے تاریخ پر بہت اثر کیا ہے۔ یعنی اگر لیونارڈو نے اتنی زیادہ دولت نہ کمائی ہوتی تو شاید ونسٹن چرچل پیدا ہی نہ ہوتا دراصل لیونارڈو ونسٹن چرچل کا نانا تھا۔

جب ونسٹن چرچل کے دادا کے پاس بارہ لاکھ پونڈ آئے تو اس نے کچھ رقم سے نیویارک کے ہفت روزہ اخبار "ٹائمز" کے چند حصے خرید لئے' دو ریس کورس بنوائے دنیا بھر کی سیر کی اور اپنے یہاں برطانیہ کے بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کرنا شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی خوبصورت امریکی لڑکی جینی جیروم کی ملاقات لارڈ اینڈلف چرچل سے ہوئی اور دونوں نے آپس میں شادی کر لی۔ ان کی شادی کے بعد 30- نومبر 1874ء کو ونسٹن چرچل پیدا ہوا۔

ونسٹن چرچل نصف امریکی ہے اس کے باوجود وہ آج کے دور کا اہم ترین برطانوی ہے۔

اس نے عجیب و غریب زندگی بسر کی ہے۔

میرے خیال میں جس قدر ولولہ انگیز اور معرکہ خیز اس کی زندگی ہے شاید روئے زمین پر کسی دوسرے شخص کی ہو گی۔ برطانیہ میں وہ ایک مسلمہ طاقت اختیار کر چکا ہے۔ 1911ء میں وہ برطانوی بحری فوج کا انچارج تھا۔ تقریباً پون صدی سے وہ حالات اور انسانوں کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیے ہے اور بڑا اچھا وقت گزار رہا ہے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بچپن میں بھی ونسٹن چرچل کی یہی خواہش تھی کہ وہ ایک سپاہی بنے۔ بعض دفعہ وہ سارا دن کھلونوں کے سپاہیوں کی فوجوں سے کھیلتا رہتا۔ بعد میں اس نے سینڈ ہارٹ کے نامور فوجی کالج سے سند حاصل کی۔ پھر وہ کئی برس برطانوی فوج میں پیشہ ور سپاہی رہا۔

1900ء میں ونسٹن چرچل اپنی بہادری اور جرات کے سبب مشہور ہو گیا۔ درحقیقت اس کی بے باک جرات نے اسے اس قدر مشہور کر دیا کہ چھبیس برس کی عمر میں اسے پارلیمان کا رکن چن لیا گیا۔

ہوا یوں کہ 1899ء میں وہ "مارننگ پوسٹ" کا جنگی رپورٹر بن کر اڑھائی سو پونڈ ماہانہ تنخواہ پر جنوبی افریقہ جنگ بوائر کی خبریں بھیجنے کے لئے چلا گیا۔ یہ تنخواہ بہت زیادہ تھی لیکن وہ اس کا واقعی مستحق تھا کیونکہ ونسٹن چرچل نے تھوڑے ہی دنوں میں خود کو مشہور جنگی نامہ نگار بنا لیا تھا۔ وہ تازہ ترین خبریں حاصل کرنے کے لئے دشمن کے علاقے میں گھس جاتا وہ فقط خبریں ارسال ہی نہ کرتا تھا بلکہ خود بھی خبروں کی سرخی بن جاتا تھا۔ جب بوائروں نے اسے پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا تو یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی اور جب وہ جیل سے فرار ہو گیا تو اس خبر کو اور بھی اہمیت دی گئی۔ کیونکہ بوائر جنگ کا اہم ترین قیدی کھو چکے تھے۔ ایک برطانوی لارڈ کا بیٹا۔

بوائروں نے اسے زندہ یا مردہ پکڑنے کا بہت بڑا انعام مقرر کیا۔ قید سے فرار ہونے کے بعد چرچل نے سینکڑوں میل دشمن کے علاقے میں سفر کیا۔ ہر ریلوے سٹیشن اور پل پر بوائر سپاہیوں کے پہرے لگے ہوئے تھے۔ وہ پیدل اور مال گاڑیوں پر سفر کرتا رہا۔ رات کے وقت وہ جنگلوں، کھیتوں اور کوئلے کی کانوں میں سو جاتا اس نے کئی دریا تیر کر عبور کیے۔ افریقی وسیع میدانوں میں بھوکے گدھ اس کے سر پر منڈلاتے اور اس انتظار میں رہتے کہ کب وہ بھوک سے نڈھال ہو کر گرے اور وہ اسے شکار بنائیں۔

اس کے فرار کی داستان ایک بہترین شکار تھی۔ لیکن ونسٹن چرچل اسے مزید سنسنی خیز بنانے کا انداز جانتا تھا۔ یہ کہانی اس نے "مارننگ پوسٹ" کے لئے لکھی۔ حیرت اور ڈرامے سے بھرپور کہانی جو 1900ء کی بہترین اخباری کہانی قرار دی گئی۔ یہ کہانی سارے انگلینڈ نے بڑے جوش و خروش سے پڑھی۔ انگلینڈ نے ایک قومی ہیرو کی حیثیت سے چرچل کا استقبال کیا۔ اس کی مہمات کے بارے میں ایک گیت لکھا گیا۔ لاکھوں لوگ اس کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے۔ اسے بڑے تزک و احتشام سے پارلیمان کا رکن چنا گیا۔

1921ء زندگی میں چرچل کا یہ نصب العین رہا ہے۔ "خطرے سے ہرگز مت بھاگو۔"

میں وہ پینتالیس لیکچر دینے کے لئے امریکہ گیا۔ ہر تقریر کے اسے 320 پونڈ ملنے تھے لیکن سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کو معلوم ہو گیا کہ امریکہ میں چرچل کی جان کو خطرہ ہے اس کے بعض حاسدوں نے اسے امریکہ میں قتل کرنے کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ لیکن اس خطرے کے باوجود چرچل نے اپنا پروگرام تبدیل نہ کیا..... اور لیکچروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب وہ ایک مغربی شہر میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنانے والے گروہ کے بعض افراد نے اس کا لیکچر سننے کے لئے ٹکٹ خرید لیا ہے۔ شہر کے چیف آف پولیس کو خبردار کر دیا گیا اور لیکچر ملتوی کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ لیکن چرچل کے منیجر لوئیس جے' البر نے لیکچر ملتوی کرنے کے خلاف احتجاج کیا اور چرچل نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "البر تم ٹھیک کہتے ہو۔ انسان کو خطرے سے بھاگنا نہیں چاہئے اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو خطرہ دوگنا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ دلیری سے خم ٹھونک کر سامنے آ جاتے ہیں تو خطرہ نصف رہ جاتا ہے۔"

خطرے سے بھاگنے کے بجائے ونسٹن چرچل اکثر اس کی طرف بڑھا کرتا تھا جب وہ برطانوی بحری فوج کا انچارج تھا تو ان دنوں برطانوی نیوی کے پاس تقریباً نصف درجن ہوائی جہاز تھے۔ یہ 1911ء کا ذکر ہے اور ہوائی جہاز ایجاد ہوئے ابھی آٹھ برس ہوئے تھے لیکن ان دنوں جہاز چلانا یا اس میں سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا اس کے باوجود چرچل خود جہاز چلانے پر اصرار کیا کرتا وہ اپنا ہوائی جہاز خود چلاتا اور ایسا کرتے وقت اسے کئی حادثات پیش آئے وہ بال بال موت کے منہ سے بچا۔ حکومت نے اسے ہوائی جہاز چلانے سے منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آیا کیونکہ اسے ہوائی جہاز چلانے میں بے حد مزا آتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ وہ اس نئی ایجاد کے متعلق پورا علم حاصل کرنا چاہتا تھا اور جانتا تھا کہ آئندہ جنگ میں اسے بہت زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ برطانوی نیوی کی ایئر فورس کی تشکیل میں ونسٹن چرچل کا بہت بڑا دخل ہے۔

ونسٹن چرچل کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کا مصمم ارادہ ہے اس نے اپنے آپ کو جس طرح تعلیم و تربیت دی ہے وہ اس سلسلے میں ایک اچھی مثال ہے جوانی میں اس کا علم کچھ اتنا وسیع نہ تھا اسے اطالوی' یونانی اور فرانسیسی سے نفرت تھی اس بات پر اس کا بڑا یقین تھا کہ کسی غیر ملکی زبان پر وقت صرف کرنے سے پہلے انگریزی پر مہارت رکھنی اشد ضروری ہے۔ اپنے اس خیال میں وہ تھا بھی صحیح۔ چونکہ اسے غیر ملکی زبانوں اور ریاضی سے سخت نفرت تھی' اس لئے جماعت میں اس کا شمار نکھے طلبا میں ہوتا تھا لیکن ریاضی سے نفرت کے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

باوجود وہ چار برس تک وزیر مال رہا۔

سینڈ ہارٹ کے فوجی کالج میں داخل ہونے کے لئے اس نے تین دفعہ امتحان دیا اور تینوں دفعہ فیل ہوا۔ آخر چوتھی دفعہ وہ پاس ہوا۔

سینڈ ہارٹ اور ہارو کے دو بہترین فوجی سکولوں میں تعلیم پانے کے بعد ایک دن اسے احساس ہوا کہ وہ عملی طور پر تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس وقت اس کی عمر بائیس برس تھی اور وہ ہندوستان میں مقیم برطانوی فوج کا ایک افسر تھا۔ تب اس نے اپنے آپ کو تعلیم دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے انگلینڈ اپنی والدہ کو لکھا کہ وہ اسے سوانح حیات، تاریخ، فلسفے اور اقتصادیات پر کتابیں ارسال کر دے۔ دوپہر کے وقت جب اس کے دوسرے ساتھی افسر سوئے ہوتے تو وہ مطالعے میں مشغول رہتا اس نے افلاطون سے گبن اور شیکسپئر سب کا مطالعہ کر ڈالا۔ اس نے شگفتہ اور رواں دواں نثر لکھنے میں کئی برس صرف کئے۔ ایک بڑے مقرر سے اس نے خود کو ایک آتش بیاں مقرر میں ڈھال لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران، جب ونسٹن چرچل برطانیہ کا وزیراعظم تھا تو وہ روزانہ چودہ سے سترہ گھنٹے کام کیا کرتا تھا اور بعض اوقات پورا پورا ہفتہ، اب بھی وہ بڑے جوش و خروش سے کام کرتا ہے اور اپنے کئی سیکرٹریوں کو ہر وقت مصروف رکھتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے دوران میں ستا لیتا ہے اور تھکنے سے پہلے آرام کر لیتا ہے۔ وہ صبح ساڑھے دس بجے سے پہلے بستر سے نہیں نکلتا۔ لیکن بستر سے نکلنے سے تین گھنٹے پہلے وہ لیٹا لیٹا ٹیلی فون کرتا اور خط وغیرہ لکھواتا رہتا ہے۔ بستر چھوڑنے کے بعد وہ ایک پرانے استرے سے شیو بناتا ہے۔

وہ ایک بجے کھانا کھاتا ہے۔ ایک گھنٹہ سوتا ہے اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پانچ بجے وہ پھر بستر میں گھس جاتا ہے اور نصف گھنٹہ دوبارہ آرام کرتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نصف شب تک اکثر کام کرتا ہے۔

جب انگلینڈ کے سیاستدان ہٹلر سے بے خبر دوسرے کاموں میں مصروف تھے۔ چرچل انہیں ہٹلر کے آئندہ ارادوں سے خبردار کرتا اور جنگ کے لئے تیاری کرنے کے لئے کہتا رہا اگر برطانیہ نے اس وقت اس کی آواز پر سنجیدگی سے توجہ دی ہوتی تو دوسری جنگ عظیم ایک دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایلی کلبرٹ سن

اس نے چھ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اس کے باوجود وہ چھ برس پیشہ ور جواری کی حیثیت سے روزی کماتا رہا۔

1943ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس کا نام تھا "مکمل امن" "جنگ کیونکر چھڑتی ہے اور امن کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے" یہ کتاب ایلی کلبرٹ سن نے لکھی تھی جس نے اپنی عمر عزیز کے چار برس ایک اہم اور سنجیدہ مسئلہ حل کرنے میں صرف کر دیئے تھے۔ مسئلہ جس سے ہم سب دوچار ہیں آئندہ جنگ کو روکنے کا مسئلہ۔

نیویارک ٹائمز نے کلبرٹ سن کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے منطق اور خیال کا ایک شاندار امتزاج قرار دیا تھا۔

عجیب بات ہے کہ یہ کلبرٹ سن وہی کلبرٹ سن ہے جسے دنیا کے لاکھوں لوگ تاش کے ایک کھیل "کنٹریکٹ برج" کے موجد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کھیل کی ایجاد نے اسے نامور اور امیر بنا دیا۔ لیکن کلبرٹ سن برج سکھانے کو ہمیشہ ایک ثانوی کام کی حیثیت دیتا رہا ہے۔ کئی برس پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ زندگی میں اس کا اصل مقصد عوام کی نفسیات کا مطالعہ کرنا تھا۔ یعنی لوگ ہجوم اور قوم کی حیثیت سے کس طرح برتاؤ کرتے ہیں۔

کلبرٹ سن کی سوانح حیات سات سو صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جس کا نام "ایک آدمی کی عجیب زندگیاں" ہے۔ اس عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ ایلی کلبرٹ سن نے ایک نہیں بلکہ کئی زندگیاں بسر کی ہیں۔ اور تمام زندگیاں عجیب و غریب ہیں۔ عجیب و غریب نہیں بلکہ مضحکہ خیز۔

اس کی سوانح حیات ایک امریکی لکھ پتی کے بیٹے کی کہانی ہے جو ایک روسی انقلاب پسند بن گیا۔ اس نے کالج کے دنوں میں طلباء کے درمیان ایک خفیہ انقلابی کمیٹی تشکیل کی اور ایک بالشویک اخبار کی کاپیاں چوری چھپے روس میں درآمد کرنے لگا۔ یہ اخبار لینن سوئزرلینڈ

سے شائع کرتا تھا۔

یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے۔ جو اپنا آرام دہ گھر چھوڑ کر غریبوں کے درمیان زندگی بسر کرنے لگا۔ اکثر اسے بھوک سے تنگ آ کر گلیوں میں روٹی مانگنی پڑتی تھی۔

ایلی کلبرٹ سن کی کہانی ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جس کا والد ایک خدا رسیدہ مذہبی بزرگ تھا اور جس نے اپنے بیٹے سے کہہ رکھا تھا کہ تاش کھیلنا ایک گناہ سے کم نہیں۔ اس کے باوجود وہ دنیا کا بہترین تاش کھیلنے والا تھا۔

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے' جس نے لوگوں کو برج کا کھیل سکھا کر دو لاکھ پونڈ کمائے۔ اس کے باوجود وہ روس میں قید ہونے سے پہلے تاش کھیلنا بالکل نہ جانتا تھا۔

ایلی کلبرٹ سن کی کہانی ایک امریکی شہری کی کہانی ہے جو روس میں پیدا ہوا' ایک امریکی جو آٹھ زبانیں بول سکتا تھا۔ لیکن جب وہ اٹھارہ برس کا تھا تو انگریزی کے ایک سو الفاظ سے زیادہ اس کا ذخیرہ الفاظ نہ تھا۔ ییل یونیورسٹی نے اسے اس وقت تک داخل نہ کیا۔ جب تک کہ اس نے انگریزی سیکھنے پر کئی ماہ صرف نہ کئے۔ اس نے چھ نامور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی اس کے باوجود وہ چھ برس تک پیشہ ور جواری کی حیثیت سے اپنی روزی کماتا رہا۔

"ریڈر ڈائجسٹ" نے کلبرٹ سن کو ایک جنئیس قرار دیا ہے' لیکن کئی ماہ وہ ایک فاقہ مست کی زندگی گزارتا رہا۔ اور گربستنوں سے روٹی مانگا کرتا تھا۔ یہی عورتیں بعد میں روپے خرچ کر کے اس کے آٹوگراف حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اس کی سوانح حیات میں جو بات مجھے سب سے زیادہ دلچسپ لگی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے خوابوں کی شہزادی کس طرح حاصل کی تھی۔

کلبرٹ سن نے مجھے بتایا کہ اسے اس بات پر اکثر حیرت ہوتی تھی کہ نوجوان کتنی جلدی اور افراتفری کے عالم میں لڑکی کی تلاش کر کے شادی رچانے کی فکر کرتے ہیں' ایک شخص عموماً ایسی لڑکی سے شادی کرتا ہے جسے وہ سکول کے دنوں میں' کاروبار کے دوران میں یا کسی کے گھر ملا ہو۔ کلبرٹ سن نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی بیوی اس طرح تلاش کرے گا۔ جس طرح وہ ایک اچھا سٹینو گرافر تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اچھا سٹینو گرافر حاصل کرنے کے لئے وہ اخبار میں اشتہار دے دیتا اور پھر امیدواروں میں سے اپنی مرضی کے مطابق ایک کو چن لیتا۔ کیا اس نے بیوی کے لئے بھی اشتہار دیا۔ نہیں ایسا نہیں وہ ذرا

باریک بین واقع ہوا تھا۔ وہ اٹلی گیا اور وہاں خود کو ایک امریکی آرٹسٹ ظاہر کر کے اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ اسے ایک ماڈل لڑکی کی ضرورت ہے اس نے اشتہار میں لکھا تھا کہ اسے کس قسم کی لڑکی کی ضرورت تھی۔ اس کی کمر کولھوں کا ناپ' آنکھوں کا رنگ' چہرے کے خدوخال اور عمر' یہ سب باتیں اشتہار میں درج تھیں۔

اس نے یہ اشتہار اٹلی کے پیڈ ماؤنٹ کے علاقے میں جو اپنی حسین و جمیل عورتوں کے لئے مشہور ہے۔ یہ ایک بڑا رومانی موقع تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک ماہر نفسیات سے مشورہ لیا اور انٹرویو سے پہلے محبت کے فن پر جس قدر کتابیں مل سکیں۔ پڑھ ڈالیں۔

اس کے مطالبات اتنے کڑے تھے کہ ان پر بہت کم لڑکیاں پوری اتر سکتی تھیں اور اسے امید تھی کہ نصف درجن سے زیادہ لڑکیاں انٹرویو کے لئے نہ آئیں گی۔ لیکن اس کی توقع کے برعکس تین سو لڑکیاں آئیں اس نے اشتہار میں لڑکیوں کی عمر اٹھارہ سے بیس برس لکھی تھی۔ کلبرٹ سن نے مجھے بتایا کہ ان میں سے بعض کی عمر چالیس برس سے اوپر تھی۔

اس نے ان تمام لڑکیوں کو خط لکھے کہ وہ اسے فلاں فلاں چوک میں ملیں۔ ہر لڑکی کو الگ الگ وقت دیا گیا تھا اور درمیان میں پندرہ منٹ کا وقفہ تھا۔ مقررہ وقت پر لڑکیاں آتی رہیں اور وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر یہ جملہ دہراتا رہا۔ شکریہ محترمہ میں نے اپنا ماڈل چن لیا ہے۔" یہ سلسلہ کئی دن تک کئی گھنٹے جاری رہا۔ تب اچانک اسے اپنے خوابوں کی شہزادی مل گئی۔ انیس برس کی شاہانہ بالوں والی اور خوبصورت آنکھوں والی لڑکی' حسن و رعنائی کی جامع پیکر' وہ..... آہستہ آہستہ اور فن کارانہ انداز میں اس کی محبت جیتنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اطالوی زبان سیکھنے کے لئے اسے ملازم رکھ لیا۔ دانتے کا "مقدس طربیہ" اس سے پڑھنے کی خاطر۔

اچانک اس رومانس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کئی روز سے پولیس اس رومیو کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ جس نے خود کو امریکی آرٹسٹ ظاہر کر رکھا تھا اور جو ایک عوامی چوک کے مختلف گوشوں میں تین سو لڑکیوں سے انٹرویو کر چکا تھا۔ ممکن تھا امن کے دنوں میں پولیس اس کی راہ میں حائل نہ ہوتی' لیکن وہ روسی لہجے میں اطالوی بولتا تھا۔ لہٰذا پولیس نے..... روسی جاسوس سمجھتے ہوئے اسے فوراً" اٹلی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

کئی برس بعد اسے نیویارک میں اپنے خوابوں کی شہزادی مل گئی لیکن اس دفعہ کوئی اشتہار دیئے بغیر۔

ایلی کلبرٹ سن کا والد اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ جسے زندگی میں ہنگامہ آرائی بہت پسند تھی۔ وہ روس گیا اور وہاں اس نے کاکاسس میں تیل کے ذخیرے دریافت کئے۔ یہی وہ ذخیرے تھے جن پر قابض ہونے کی خاطر ہٹلر نے دس لاکھ جانیں قربان کر دیں۔

کلبرٹ سن کے باپ نے تیل کے ان ذخیروں سے لاکھوں پونڈ کمائے اور ایک کلسک جرنیل کی بیٹی سے شادی کر لی۔

اس کا باپ اپنے بیٹے کو امریکہ میں تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اسے ژیل یونیورسٹی میں بھیج دیا۔ لیکن ژیل میں ایلی کا بالکل دل نہ لگا۔ زار روس کے سپاہیوں نے عوام پر ظلم و ستم کئے تھے۔ کلبرٹ سن خود بھی ان کا مزا چکھ چکا تھا۔ روسی حکومت نے اس کی انقلابی سرگرمیوں کے سبب اسے قید میں ڈال دیا اور اس کی محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔ روس میں وہ زندگی اور موت کے اتنے پہلو دیکھ چکا تھا کہ اب یونیورسٹی کی تعلیم اسے بیکار محسوس ہوتی تھی۔

نیو ہیون میں چار ماہ گزارنے کے بعد اس نے اپنے والد کو لکھا کہ وہ اسے خرچ بھیجنا بند کر دے۔ کیونکہ وہ نیویارک کے غریب طبقے میں زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں جا رہا ہے "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کے غریب لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔" اگلے تین برس اس نے اسی تجربے میں بسر کئے۔ وہ ایک بڑا ادیب بننے کا خواہش مند تھا اور جانتا تھا کہ انسان فقط کتابوں کے مطالعے سے یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ انسانی فطرت کو سمجھ کر اس کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا۔

کلبرٹ سن امریکی زندگی کے اکھڑ اور تاریک پہلوؤں کے بارے میں پوری پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا کئی ماہ تک ایک لکھ پتی کا یہ بیٹا چوروں، جواریوں، بدمعاشوں اور دھوکہ بازوں کے درمیان رہا۔ کچھ عرصہ اس نے گشتی سستے مکانوں میں بھی گزارا۔ جہاں آوارہ اور شرابی لوگ چھ پنس دے کر رات بسر کرتے تھے۔

کچھ عرصہ وہ ایک پبلک ہاؤس میں بطور مددگار کے کام کرتا رہا۔ بعد میں وہ اخبار فروخت کر کے اپنی روزی کمانے لگا۔ اس کام سے اتنے پیسے مل جاتے کہ دو وقت کا کھانا کھا سکے۔ وہ کوپر یونین میں شبینہ سکول میں تعلیم حاصل کرتا اور ایک خستہ حال تاریک کمرے میں رہتا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کئی ماہ بعد اسے مزدوروں کے ایک گروہ میں ٹائم کیپر کی ملازمت مل گئی۔ یہ مزدور کینیڈا کے پہاڑی علاقے میں ریلوے لائن بنا رہے تھے۔ اس نے اپنی جوشیلی تقریروں سے انہیں بتایا کہ ٹھیکیدار انہیں لوٹ رہا ہے اور ان کی محنت سے کہیں کم اجرت دیتا ہے' اس نے مزدوروں میں ہڑتال کرا دی اور ان کے حوصلے بڑھا دیئے۔ آخر ٹھیکیدار نے یہ خطرناک آدمی کمپنی سے باہر نکال پھینکا۔

وہاں سے نزدیکی قصبہ دو سو میل تھا۔ وہ پیدل چل کر وہاں پہنچا' اور اپنا پیسہ سان فرانسسکو کے ایک بنک میں جمع کرا کے بحرالکاہل کی طرف پیدل چل پڑا' وہ مال گاڑیوں اور ٹرکوں پر سفر کرتا اور رات کے وقت گلیوں میں روٹی مانگتا۔ مونٹانا میں اس نے روٹی کی خاطر برتن دھوئے اور کیلی فورنیا میں پھل توڑنے کا کام کیا جہاں کہیں بھی وہ گیا اس نے لوگوں اور زندگی کا مطالعہ کیا۔

وہ کیلی فورنیا میں برکلے کے مقام پر سیاسی بدنظمی اور خانہ جنگیوں کے متعلق کتابیں پڑھتا رہا۔ پھر اس نے انقلابی ادب کا مطالعہ ایک دم ترک کر دیا اور میکسیکو میں پھوٹنے والی ایک بغاوت میں شریک ہو گیا' جس پر اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اگر اس کے پاس امریکی پاسپورٹ نہ ہوتا تو اسے گولی سے اڑا دیا جاتا۔

کلبرٹ سن کے باپ نے اپنی ساری دولت روسی حکومت کے "گولڈ بانڈز" میں لگا دی تھی۔ جب لینن نے زار روس کا تختہ الٹ کر روس میں اشتراکی حکومت قائم کی تو وہ تمام لاکھوں ڈالر جو کلبرٹ سن کے باپ نے گولڈ بانڈز میں لگائے تھے ان کی حیثیت ڈاک کے ٹکٹوں سے زیادہ نہ رہی اور وہ بالکل تباہ ہو گیا۔

1921ء میں کلبرٹ سن کے والد نے نیویارک میں ایک چوکیدار کی آسامی حاصل کرنے کے لئے درخواست دی۔ ایلی کلبرٹ سن نے فلاسفی اور سوشیالوجی پڑھانے کے..... لئے ایک استاد کی جگہ چاہی مگر ناکام رہا۔

اس نے کوئلے فروخت کرنے چاہے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کافی فروخت کرنے میں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر اس نے نیویارک میں اشتراکیوں کے ایک گروہ کو فرانسیسی پڑھانی شروع کر دی۔

اس وقت لوگوں کو برج سکھانے کا خیال اس کے ذہن میں نہ آیا تھا اس زمانے میں وہ تاش بھی اچھی نہ کھیلتا تھا اور جب کھیلتا تھا تو اپنے ساتھی سے اس قدر سوالات پوچھتا کہ وہ

تنگ آ جاتا اور دوسری دفعہ اس سے کھیلنے کی قسم کھا لیتا' اس نے برج کے متعلق کتابیں پڑھیں لیکن ان سے کچھ نہ حاصل کر سکا۔ آخر اس نے برج کے بارے میں خود ایک کتاب لکھنی شروع کر دی اور بعد میں چار مزید کتابیں لکھیں۔ وہ کتابیں بے کار ثابت ہوئیں۔ مگر وہ اس حقیقت سے پہلے ہی واقف تھا۔ لہٰذا شائع کرانے سے پہلے ہی اس نے ان کے مسودے پھاڑ دیئے۔

لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور برج کے کھیل پر اپنی تمام تر توجہ صرف کرتا رہا آخر وہ کنٹریکٹ برج ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب برج کے متعلق اس کی کتابیں بارہ سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہیں۔

ایلی کلبرٹ سن نے مجھے بتایا کہ "مکمل امن" لکھنے پر اس نے جو چار برس صرف کئے ہیں۔ وہ اس کی زندگی کے بہترین سال ہیں۔ اس کتاب میں اس نے آئندہ جنگوں کا سدباب کرنے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی ہیں۔ ممکن ہے کہ برج کا یہ ماہر دائمی امن قائم کرنے میں ہماری جدوجہد میں اہم اور نمایاں حیثیت اختیار کر جائے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جوزف سٹالن

اس کے والدین غلام تھے۔ لیکن اس نے بیس کروڑ لوگوں پر حکمرانی کی۔

روئے زمین پر سب سے طاقتور ایک ایسا شخص تھا۔ جس سے لاکھوں آدمی محبت اور لاکھوں نفرت کرتے تھے' کسی زمانے میں اس کے والدین مزارع تھے۔ حقیقی معنوں میں غلام۔ زمین کے ساتھ ساتھ ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی' لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ دہقانی والدین کا یہ بیٹا ساری زمین کے چھٹے حصے کا حکمران بن گیا۔ اس کے ہاتھ میں بیس کروڑ لوگوں کی زندگی اور موت تھی۔

آپ خواہ اس سے محبت کرتے ہوں یا نفرت' لیکن ایک بات یقینی ہے کہ آپ اسے نظر انداز ہرگز نہیں کر سکتے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ زندگی میں فقط ایک نصب العین کے ساتھ وہ جس طرح وفادار رہا ہے بعض لوگ اسے نظر انداز کس طرح کر دیتے ہیں۔ اس کا یہ نصب العین تھا کہ اس کے ملک پر اس کے عوام کی حکومت ہو۔ اور وہ اپنے عوام کو حکومت کرنے کے قابل بنا سکے۔

اس کا نام سٹالن تھا۔ جوزف سٹالن لیکن یہ اس کا اصلی نام نہ تھا اس کا حقیقی نام آئیوسف وسار ونیووچ ڈزوگا شولی تھا۔

سٹالن 1879ء میں روسی تیل کے ذخیروں کے قریب ایک چھوٹے سے تاریک اور بوسیدہ مکان میں پیدا ہوا۔ اس مکان کا ماہوار کرایہ چھ شلنگ تھا۔

سٹالن جارجیا کا رہنے والا تھا۔ وہ بحیرہ ظلمات اور بحیرہ کیسپین کے درمیان واقع ہے۔ جارجیا کے باشندے آج بھی اپنی زبان بولتے ہیں۔ اگرچہ ان کے علاقے کو روس سے ملحق ہوئے ڈیڑھ سو برس گذر چکے ہیں۔ سٹالن بھی بیس برس کی عمر تک جارجین زبان بولتا رہا۔ یہ زبان روسی سے اتنی ہی مختلف ہے۔ جتنی ہسپانوی زبان انگریزی سے' سٹالن جارجین لہجے میں روسی بولتا تھا۔

امریکہ میں غلامی کی لعنت دور ہونے سے تین برس پہلے زار الیگزینڈر دوم نے روس

میں "غلام مزارعہ" کا قانون ختم کر دیا۔ جب جوزف سٹالن 1879ء میں پیدا ہوا۔ تو اس کے والدین آزاد ہو چکے تھے۔ اس کے والد نے بسر اوقات کرنے کے لئے جوتے مرمت کرنے کی دوکان کھول لی۔

آیئے' اب ہم دیکھیں کہ جوزف سٹالن روس جتنے بڑے ملک کا کس طرح حکمران بن گیا؟ ایسا ملک جس پر زار روس پانچ سو برس تک حکومت کرتا چلا آ رہا تھا۔

اس نے اپنی ابتدائی تعلیم کچھ اس طرح حاصل کی کہ اسے اپنے گندے اور افلاس زدہ ماحول سے نفرت ہو گئی اور وہ اس سے دور ہو گیا۔ اسی تعلیم نے اس کے اندر ایک مقصدالعین پیدا کر دیا۔ سٹالن کا باپ اسے موچی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں' دوسری ماؤں کی طرح اپنے بیٹے کی ترقی اور عروج کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی ان پڑھ ماں جو مکمل غلامی کے ماحول میں پیدا ہوئی تھی اور جو دونوں وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے سارا دن کپڑے سیتی اور برتن دھوتی رہتی تھی۔ اپنے بیٹے کے لئے بہتر اور اچھی دنیا کی خواہشمند تھی۔ وہ اکثر چرچ میں جا کر مقدس ماں کے مجسمے کے سامنے شمعیں جلا کر گھنٹوں اپنے بیٹے کے لئے دعائیں مانگتی اور روتی رہتی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا ایک پادری بن جائے۔ اسے اپنی مشقت کی پروا نہ تھی وہ ایک مقدس مقصد کے لئے کام کرتی تھی۔

اس نے کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹے کے لئے ایک مذہبی وظیفہ حاصل کر لیا اور سٹالن ایک مذہبی ادارے میں پادری کی تربیت اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل ہو گیا۔ وہاں وہ چند برس رہا۔ پھر ایک دن جب کہ وہ پندرہ برس کا تھا۔ ایک واقعہ رونما ہوا۔ بذات خود یہ چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن اس کے نتائج اتنے گہرے ثابت ہوئے کہ ایک دن انہوں نے دنیا کو ہلا دیا۔ بات فقط اتنی تھی کہ سٹالن کے ہاتھ ایک ایسی کتاب لگ گئی' جس نے تاریخ عالم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کتاب سے زیادہ آج تک کوئی دوسری غیرمذہبی کتاب اثر انگیز ثابت نہیں ہو سکی۔ وہ کتاب کارل مارکس کی تصنیف "کیپٹل" (سرمایہ) تھی۔

اس کتاب نے سٹالن کے جذبات کو اس طرح متحرک کر دیا کہ وہ فوراً" کارل مارکس کے آدمیوں کے ساتھ خفیہ سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔ اس کتاب سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی زندگی عوام کے مفاد کی خاطر لڑنے کے لئے بسر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے اس افلاس کے خلاف بغاوت کر دی جس میں روس کے ایک کروڑ کسان بے دست و پائی کے عالم میں زندگی گذار رہے تھے۔ وہ افلاس اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بہت سے روسی کسانوں کے پاس نمک خریدنے کے لئے بھی پیسے نہ ہوتے

تھے۔

سٹالن کا یقین تھا کہ کسانوں اور مزدوروں کے حالات زندگی بہتر بنانے کا واحد ذریعہ انقلاب ہے۔

اس کی انقلابی سرگرمیوں کے سبب اسے مذہبی تربیتی ادارے سے نکال دیا گیا۔ اگلے پچیس برس وہ اپنے نصب العین کی خاطر دن رات بے تکان کام کرتا رہا کئی سال تک وہ بے گھر رہا۔ کئی کئی ہفتے وہ ہر رات مختلف جگہوں پر بسر کرتا۔ اپنے نصب العین کے لئے وہ آٹھ برس قید خانے میں تکلیفیں برداشت کرتا رہا۔

لیکن اس مصیبت کے دور میں بھی وہ ہمیشہ اپنی پارٹی کے لئے کام میں مصروف رہا۔ وہ انقلابی تقریریں کرتا اور سینٹ پیٹرز برگ میں خفیہ طور پر ایک انقلابی اخبار شائع کرتا۔

سٹالن اس قسم کے انقلاب پسندوں میں سے تھا جو اپنی آزادی ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جب 1905ء کا انقلاب ناکام ہوا تو لینن اور ٹراٹسکی اپنی جان بچانے کے لئے سوئزرلینڈ بھاگ گئے۔ لیکن سٹالن اپنی زندگی کے خطرے کے باوجود روس ہی میں رہا۔ زار روس کی..... پولیس ہر وقت اس کی تلاش میں رہتی اور اگر وہ اس کے ہاتھ آ جاتا تو کسی دیوار کی طرف اس کا منہ کر کے اسے گولی سے اڑا دیا جاتا۔

جلاوطنی کے زمانے میں لینن چوری چھپے روس میں اشتراکی ادب بھیجتا رہتا' ایسے مضمون سگریٹ کے کاغذوں پر لکھے ہوتے اور انہیں شراب کے ڈرموں میں چھپا کر روس میں در آمد کیا جاتا۔ سٹالن ان مضمونوں کو اپنے خفیہ اخبار میں شائع کرتا۔

سٹالن کو چھ مرتبہ سائبیریا میں جلا وطن کیا گیا۔ پانچ مرتبہ وہ وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرار کے بعد وہ پھر سے اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہو جاتا قید خانے' کوڑے اور موت کی دھمکیاں سٹالن کو متزلزل نہ کر سکیں۔ بلکہ انہوں نے اس کا اعتقاد مزید مستحکم کر دیا۔ وہ زار روس کی حکومت کا تختہ الٹ کر روس کی دولت وہاں کے عوام کو دینا چاہتا تھا۔ چھٹی دفعہ جب زار روس کی پولیس نے اسے پکڑا تو وہ اس کی پوری پوری نگرانی کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ پولیس نے سپاہیوں کی نگرانی میں لے اسے ایسے علاقے میں جلا وطن کر دیا۔ جہاں سے بہت تھوڑے لوگ بچ کر واپس آئے تھے۔ یہ جگہ سائبیریا میں بحر منجمد جنوبی سے فقط اٹھارہ میل اس طرف تھی۔ وہاں اسے قید میں ڈالنے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر سٹالن وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو سردی اور بھوک سے مر جاتا۔ اس نے چار برس انتہائی غیر انسانی اور خوفناک ماحول میں بسر کیے وہاں اسے کئی کئی روز کھانے کے

لئے کچھ نہ ملتا۔ اگر اسے لکڑیوں کی ضرورت ہوتی تو وہ جنگل جاتا اور وہاں سے خود لکڑیاں کاٹ کر لاتا۔ وہاں اتنی سردی تھی کہ اس سے مطالعہ بھی نہ ہو سکتا۔ اپنے آپ کو منجمد ہونے سے بچانے کے لئے اسے سخت جسمانی محنت کرنا پڑتی' اس کی حالت خواہ کتنی ہی مایوس کن کیوں نہ تھی لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہ کی۔ اسے یقین تھا کہ ایک روز وہ کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ آخر 1906ء میں جب روس میں انقلاب آیا۔ تو اسے بھی وہاں سے آزاد کیا گیا۔

سٹالن روسی لفظ "سٹال" سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے لوہا۔ اس کا جذبہ واقعی لوہے کی طرح نہ جھکنے والا تھا۔

یہ سٹالن ہی تھا جس نے مصیبت کے دنوں میں "بالشویک پارٹی" کا شیرازہ برہم نہ ہونے دیا اور آخر وہ انقلاب ممکن بنا دیا۔ جس نے زار روس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

سٹالن نے دو دفعہ شادی کی۔ اس کی پہلی بیوی کیتھرین ایک نوجوان مگر کم تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ان کی ازدواجی زندگی بڑی خستہ حالی میں گذری۔ سٹالن ایک انقلاب پسند تھا۔ پولیس ہر وقت اس کے تعاقب میں رہتی۔ وہ سال میں دو چار مرتبہ گھر آتا اور پھر رات کی تاریکی میں چوری چھپے بھاگ جاتا شادی کے چار برس بعد کیتھرین تپ دق سے مرگئی۔

سٹالن نے دوسری شادی چالیس برس کی عمر میں ایک ایسی لڑکی سے کی جو سترہ سال کی تھی۔ وہ بھی اپنڈکس کی تکلیف سے مرگئی۔ اس بیوی سے اس کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس کے دونوں بیٹے روسی فوجوں کے ساتھ جرمنوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ بڑا لڑکا توپ خانے میں ایک افسر تھا اور چھوٹا لڑکا ایئر فورس میں دونوں کو ان کی بہادری پر تمغے ملے تھے۔

روس کا سپریم حکمران ہونے کے باوجود سٹالن زار کے شاہی محل کے نزدیک ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو زار روس کے شاندار اور حیرت ناک محل میں بیش قیمت ساز و سامان میں رہ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اسی چھوٹے سے مکان کو ترجیح دی۔ جس میں کسی وقت زار روس کا ایک نوکر رہا کرتا تھا۔

اس کا کھانا کریملن کے باورچی خانے سے ایک سپاہی لے کر آتا' یہ وہی کھانا ہوتا ہے جسے کریملن میں کام کرنے والے دوسرے..... سینکڑوں سپاہی اور افسر کھاتے تھے۔

سٹالن نے کبھی خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہ کی تھی اسے دکھاوے سے نفرت تھی۔

وہ اجنبیوں سے ملتے ہوئے گھبراتا۔ دوسرے ملکوں کے سفیر کئی کئی سال سٹالن کو دیکھے بغیر روس میں گذار دیتے۔

جب ملاقاتی اس کے معجزے کی تعریف کرتے تو وہ فقط اتنا کہتا۔ "یہ کام اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ابھی ہمیں کرنا ہے۔"

اس قدر طاقتور ہونے کے باوجود سٹالن میں ایک بڑی اچھی صفت پائی جاتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انسان غلطی کا پتلا ہے اور اس سے کبھی نہ کبھی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اور اپنی غلطی کا اعتراف خندہ پیشانی سے کرتا۔ اس نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان میں اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کی جرات ہونی چاہیے اور وہ ان غلطیوں کی روشنی میں اپنے آپ کو حتی الامکان مختصر عرصے میں سنوارنے کی کوشش کرے۔"

سٹالن نے جو کام کرانا ہوتا اسے کرا کے رہتا۔ خواہ اس کے لئے اسے سختی ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔ روسی انقلاب کے بابا لینن نے ایک دفعہ سٹالن کے متعلق کہا تھا۔ "یہ باورچی بے حد گرم کھانا سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔"

لیکن اگر سٹالن اپنی من مانی کارروائی کے تحت نازیوں کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کرتا تو خدا جانے کتنے اتحادی سپاہیوں کو ہٹلر پر فتح پانے کے لئے جانیں قربان کرنا پڑتیں۔

ڈکٹیٹر جوزف سٹالن نے روس کو بچانے کے ساتھ جمہوریت اور ہم سب کی زندگیاں بچانے کے لئے بھی بہت کچھ کیا ہے۔ یہ سوچ کر مجھے کپکپی چھڑ جاتی ہے کہ اگر جوزف سٹالن کی سرخ فوجیں بہادرانہ قربانیاں نہ دیتیں تو نہ جانے اس وقت ہمارا کیا حشر ہوتا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کلارک گیبل

ایک زمانے میں وہ لڑکیوں سے ڈرتا تھا۔ لیکن ایک زمانے میں لڑکیاں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کام کاج چھوڑ کر سارا دن دھوپ میں کھڑی رہتیں۔

میرے خیال میں امریکی فوج میں خدمات انجام دینے والے لوگوں میں سب سے زیادہ نامور شخص کلارک گیبل تھا۔ اس کا شمار ہمارے دور کی عظیم ترین فلمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ چین' ہندوستان' پاکستان' افریقہ' یورپ اور جنوبی امریکہ میں لاکھوں فلم بین اس کے مداح ہیں۔ لاکھوں لوگ جو امریکی فوجی راہنماؤں یا امریکی تاریخ کے متعلق عملی طور پر کچھ نہیں جانتے۔

چند برس پہلے جب کلارک گیبل جنوبی امریکہ سیر کے لئے گیا تو عورتیں اس کے گلے میں بازو ڈال کر اس کے ساتھ چمٹ جاتیں۔ انہوں نے اس کا ہیٹ' کوٹ اور قمیض پھاڑ ڈالی۔ تاکہ اپنے پاس اس کی کوئی نشانی رکھ سکیں۔

فوج میں بھرتی ہونے کے بعد اس نے فلمیں دیکھنی ترک کر دیں اور دعوتوں اور محفلوں میں جانے سے پرہیز کرنے لگا۔ وہ زیادہ تر وقت چھپا رہتا۔ اس کے باوجود انگلینڈ میں اس کی مداح خواتین کے ایک گروپ نے چرچ کے اندر اس کا تعاقب کیا انگلینڈ کے ایک گاؤں میں لڑکیوں کا ایک گروہ فصل کاٹ رہا تھا۔ ان کے نزدیک ہی امریکی فوج کی ایک بٹالین نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا' جب لڑکیوں کو معلوم ہوا کہ کلارک گیبل بھی اسی بٹالین میں موجود ہے تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے امریکی فوج کی جائے قیام کے نزدیک آ کھڑی ہوئیں اور صبح سے دوپہر تک وہیں کھڑی رہیں۔

1942ء میں کلارک گیبل فوج میں بھرتی ہوا تو اس وقت اس کی عمر بیالیس برس کی تھی۔ فوج میں شامل ہونے کے لئے اس نے ہالی وڈ میں ایک فلم کا معاہدہ پھاڑ ڈالا۔ اس معاہدے کے تحت اسے ایک سال میں چالیس ہفتوں تک ہر ہفتے پندرہ سو پاؤنڈ ملنے تھے اور

یہ معاہدہ سات برس تک جاری رہنا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے دس ہفتوں میں اتنے روپے مل جاتے تھے جتنی امریکہ کے صدر کی ایک سال کی تنخواہ بنتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے ستر ہزار پونڈ سالانہ پر ایک خاکی وردی اور دس پونڈ ماہانہ تنخواہ کو ترجیح دی۔

چند برس ہوئے مجھے کلارک گیبل سے انٹرویو کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اس کا طرز سلوک بڑا دوستانہ اور منکسرانہ تھا۔ میں نے اسے بے حد پسند کیا۔

کئی مواقع پر اس کا شمار امریکہ کے دس بہترین لباس پہننے والے لوگوں میں ہوا ہے۔ جب میں نے اس کے ڈریسنگ روم میں اس سے انٹرویو کیا تو اس نے اپنی گردن کے گرد ایک ترکی تولیہ لپیٹ رکھا تھا اور ایک بوتل کے ڈھکنے کو بطور ایش ٹرے استعمال کر رہا تھا۔

کلارک گیبل نے بہت سی فلموں میں ڈرامائی کردار انجام دیئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی کردار بھی اس کی اپنی زندگی کی کہانی سے زیادہ دلچسپ اور ڈرامائی نہیں۔

جب وہ پندرہ برس کا تھا تو اسے ایک رات ایکرون (اوہیو) میں ایک چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں بھوک مٹانے کی خاطر جانا پڑا۔ اس چھوٹی سی بات نے اس کی ساری زندگی بدل دی۔ اس چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں اسے ایک گشتی تھیٹر کے چند ایکٹروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ تھیٹر ان دنوں ایکرون میں آیا ہوا تھا۔ وہ چند ماہ پہلے ایکرون آیا تھا اور ایک ربڑ فیکٹری میں بطور ٹائم کیپر کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کی اس کی زندگی اپنے والد کے ساتھ ایک دیہاتی فارم میں بھینسوں کا دودھ دوہنے اور ہل چلانے میں گزری تھی اس کام سے اسے سخت نفرت تھی۔

کلارک گیبل زندگی میں پہلی مرتبہ ایکٹروں سے ملا تھا۔ ان کی زندگی اسے اس قدر پسند آئی کہ وہ بھی تھیٹر میں سٹیج کے پیچھے چھوٹا موٹا کام کرنے پر ملازم ہو گیا اس کا یہ کام تھا کہ شو کے درمیان میں ایکٹروں کو ڈریسنگ روم سے سٹیج روم کو آنے کے لئے کہتا۔ اس کے علاوہ وہ ایکٹروں کے مختلف ذاتی کام بھی کرتا۔ مثلاً ان کے کپڑے دھوبی کو دے آتا۔ ان کی پتلونوں اور قمیضوں میں بٹن لگاتا اور ہر وہ کام کرتا جس کے لئے وہ اسے کہتے۔

اس تھیٹر میں وہ دو برس تک اسی قسم کے کام کرتا رہا۔ آپ کے خیال میں اسے تنخواہ کتنی ملتی ہو گی؟ جواباً" عرض ہے کہ اسے ایک آنہ بھی نہ ملتا تھا۔ وہ فقط تجربے کی خاطر وہاں کام کر رہا تھا۔

تو پھر وہ گزر اوقات کس طرح کرتا تھا؟ رات کو وہ سٹیج کے عقب پڑے ہوئے ایک

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

تختے پر سو جاتا اور اپنا اوور کوٹ بطور کمبل استعمال کرتا۔ جہاں تک کھانے کا تعلق ہے ایکٹر اسے بہت پسند کرتے تھے اور اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دیتے لیکن ناشتے کے وقت اسے کوئی نہ پوچھتا۔ لہٰذا اس نے ناشتہ نہ کرنے کی عادت ڈال لی۔ جب وہ دنیا کا نامور ایکٹر بن گیا اور ماہوار لاکھوں پونڈ کمانے لگا تو ان دنوں میں بھی وہ فقط دو وقت کھانا کھاتا۔ ناشتے کا پروگرام اس نے زندگی سے خارج ہی کر دیا۔

لیکن اس زمانے میں وہ ناشتہ کئے بغیر کس طرح کام کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ناشتے کی پروا ہی نہ ہوتی تھی۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق کام مل گیا تھا۔ اور اس کام نے اس کی بھوک تک مٹا دی تھی وہ خوابوں کی دنیا میں رہ رہا تھا روشنیوں، میک اپ اور رومانس کی دنیا۔ وہ اس جگہ کسی لکھ پتی سے بھی زیادہ خوش تھا۔

میں نے کلارک گیبل سے پوچھا کہ وہ اس زمانے میں زیادہ خوش تھا کہ بعد میں جب وہ دو سو پونڈ روزانہ کماتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ دولت اور شہرت کا خوشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وہ دن مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

اسے ایکرون کے تھیٹر میں کام کرتے دو برس ہو گئے تھے کہ اچانک ایک حادثے نے اسے آن لیا۔ اس کی سوتیلی ماں مر گئی۔ اس موت نے اس کے والد کے گھر کا شیرازہ درہم برہم کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کلارک گیبل کے آئندہ منصوبوں کا تار و پود بھی بکھر گیا۔

اس کے باپ نے فارم چھوڑ کر اوکلا ہوما جانے اور وہاں تیل کے ذخیروں میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اس کا باپ اس سے تنگ آ چکا تھا۔ ذرا خیال کریں کہ جس باپ کا لڑکا دو برس تک ایک تھیٹر میں مفت کام کرتا رہے اس کا باپ کیا اس سے تنگ نہ پڑے گا۔ اوکلا ہوما میں وہ اڑھائی پونڈ ہفتہ وار کما سکتا تھا۔ باپ نے اسے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دے دیا۔ وہ کوئی دلیل سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ لہٰذا اگلے دو برس کلارک گیبل ہاتھ میں ہتھوڑا لئے، تیل سے بھرے ہوئے میلے کچیلے کپڑے پہنے تیل کے ذخیروں میں کام کرتا رہا۔

آخر جب وہ انیس برس کا ہو گیا تو اس نے یہ گندہ کام ترک کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ دوبارہ اپنے خوابوں کی دنیا تھیٹر میں لوٹ جائے گا۔ وہ پھر سے ایک گشتی تھیٹر میں داخل ہو گیا۔ وہ خاصا گھٹیا تھیٹر تھا۔ اور دیہات میں خیمے گاڑ کر شو دکھایا کرتا تھا اور "چچا ٹام کا گھر" اور "چارلی کی خالہ" جیسے ڈرامے کھیلا کرتا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں نے کلارک گیبل سے پوچھا کہ اس تھیٹر میں اسے کیا تنخواہ ملتی تھی۔ میرے اس سوال پر اس نے قہقہہ لگایا۔ اس تھیٹر میں کسی کو تنخواہ نہ ملتی تھی۔ فقط ایکٹروں کے اخراجات پورے کئے جاتے اور اگر کبھی خدانخواستہ کوئی نفع ہو جاتا تو وہ لوگ اسے آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اس نے بتایا کہ ایک دفعہ اسے بھی نو شلنگ ملے تھے۔

آخر 21۔ مارچ 1922ء میں یہ تھیٹر مونٹانہ کے ایک گاؤں میں ایک طوفان و باراں میں پھنس گیا۔ کمپنی کا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ بہت سامان ناکارہ ہو گیا۔ اور وہ قابل رحم حالت تک مقروض ہو گئی۔

اگلی صبح وہ قریبی ریلوے سٹیشن پہنچا' وہ بھوکا پیاسا تھا اور سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس کی پتلون میں جا بجا پیوند لگے تھے اور جوتوں میں کئی سوراخ تھے۔ اس وقت اس کی جیب میں فقط تین پنس تھے۔ اس نے اپنے والد کو ایک تار لکھا کہ اگر وہ اسے بذریعہ تار پیسے بھجوائے تو وہ گھر آنے کو تیار ہے۔ تار لکھنے کے بعد کلارک گیبل تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ وہ کھڑا دھندلائی ہوئی آنکھوں سے برف کے طوفان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ تار بھیجے کہ نہ بھیجے۔ کیا وہ اپنا پسندیدہ کام چھوڑ کر ناپسندیدہ کام کرنے لگے؟ اسے احساس ہو گیا کہ وہ زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہے اور اسے ایک ایسا فیصلہ کرنا ہے جو اس کے مستقبل پر بہت اثر انداز ہو گا۔ آخر اس نے ہر حال میں اپنا پسندیدہ کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے تار پھاڑ ڈالا۔ سٹیشن سے باہر نکل آیا اور ایک مال گاڑی میں چوری چھپے سوار ہو کر وہاں سے چل پڑا۔

جب گاڑی "سانپوں والے دریا" کی وادی میں پہنچی تو ایک بریک مین کی نظر کلارک گیبل پر پڑ گئی۔ یہ 1922ء کا واقعہ ہے۔ بارہ برس بعد قسمت نے کلارک گیبل کو دنیا کا نامور شخص بنانا تھا۔ لیکن وہ بریک مین بھلا یہ کیسے جان سکتا تھا اس نے کلارک گیبل کو کان پکڑ کر گاڑی سے اتار دیا۔ پورٹ لینڈ تک جانے کے لئے کرایہ جمع کرنے کی خاطر اسے تین ماہ تک ایک دھوبی کے پاس کام کرنا پڑا۔

پورٹ لینڈ پہنچ کر وہ ایک دوسرے گشتی تھیٹر میں کام کرنے لگا۔ اس تھیٹر کا بھی دیوالہ پٹ گیا اور کلارک گیبل کو پھر سے پیٹ بھرنے کی خاطر مزدوری کرنی پڑی۔ اب کی دفعہ وہ سروے کرنے والی ایک ٹیم کا سامان اٹھاتا اور بعد میں ایک آرا مشین میں شہتیر چیرتا رہا۔

جب وہ دوسری مرتبہ پورٹ لینڈ آیا تو حالات ایسے تھے کہ اسے کام حاصل کرنا ناممکن

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

محسوس ہوا۔ ہر خالی جگہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی پر ہو جاتی۔ آخر وہ ایک اخبار کے اشتہاری شعبے میں کام کرنے لگا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ مختلف قسم کے "ضرورت" ہے کے اشتہار الگ الگ چھانٹ کر رکھے اور ان کی درجہ بندی کر دے۔ یہ کام کرنے کا اسے اتنا فائدہ ہوا کہ جونہی اس کے پسندیدہ کام کا اشتہار اخبار میں چھپنے کے لئے آیا وہ اس کے شائع ہونے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ یہ ایک ٹیلیفون کمپنی کا اشتہار تھا۔ جسے ایک لائن مین کی ضرورت تھی۔ گیبل تین پونڈ ہفتے کی تنخواہ پر وہاں ملازم ہو گیا۔

اس ملازمت نے اس کی زندگی کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کرانا تھا۔ ایک دن اسے پورٹ لینڈ کے لٹل تھیٹر میں ایک ٹیلیفون ٹھیک کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات سٹیج کی خاتون ڈائریکٹر جوزفین ڈلس سے ہو گئی۔

وہ ایکٹنگ کے متعلق اس سے سبق لینے لگا۔ اور آخر دونوں نے شادی کر لی۔ یہ دسمبر 1924ء کی بات ہے لیکن شہرت کے راستے پر چلنے سے اسے کئی برس مسلسل دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر "ایک روح آزاد" نامی فلم سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔

لیکن ان تمام برسوں میں وہ براڈوے میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرتا اور ہالی وڈ کے گرد منڈلاتا رہا۔ وہ سستے ہوٹلوں میں کھانا کھاتا اور فلم میں ہر قسم کا کام کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کرتا۔ کئی برس گزر گئے کسی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ آخرکار اسے بولنے والی فلم میں کام مل گیا۔ اس کی امیدوں کو پر لگ گئے۔ اب ہالی وڈ میں وہ اپنا مقام حاصل کر کے رہے گا۔ لیکن وہ غلطی پر تھا۔ اس فلم میں کام کرنے کے چھ سال بعد اسے ایک دوسری بولنے والی فلم میں کام ملا۔ مگر یہ کام بھی معمولی نوعیت کا تھا۔

آخر اسے "خوش مزاج بیوہ" میں ایک چھوٹا سا کردار مل گیا۔ دس پونڈ روزانہ معاوضے پر، کئی برس بعد جب کلارک گیبل دنیا کا نامور ایکٹر بن گیا تو اس نے اپنے سٹوڈیو میں "خوش مزاج بیوہ" کا معاہدہ فریم کرا کے دیوار کے ساتھ آویزاں کر رکھا تھا اور اس نے نیچے یہ الفاظ لکھے تھے۔ "گیبل! فقط' تمہاری یاد دہانی کی خاطر۔"

لیکن کلارک گیبل نے شہرت اور دولت کے نشے میں چور ہو کر کبھی کوئی اوچھی حرکت نہ کی تھی۔ جب وہ میامی ہوائی فوج کے سکول میں زیر تربیت تھا تو اسے وہاں کا سب سے زیادہ دلچسپ' پسندیدہ اور ایمان دار شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس نے کبھی اپنے آپ پر غرور نہ کیا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کلارک گیبل فلمی دنیا کا مانا ہوا عاشق تھا لیکن اس نے مجھے بتایا کہ جوانی کے دنوں میں لڑکیوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے بھی وہ ڈرتا تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں سے محبت کی مگر اظہار محبت کی جرات اس میں کبھی پیدا نہ ہوئی اسے ان لڑکوں پر رشک آتا تھا جو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر لڑکیوں سے باتیں کرنے لگتے تھے۔

ممکن ہے وہ لڑکیوں سے خوفزدہ ہو لیکن جنگ کے دوران میں مختلف محاذوں پر اس نے جس جرات اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے عوض اسے کئی تمغے ملے ہیں۔ اسے ملنے والی ایک سند پر یہ الفاظ تحریر ہیں۔ ''کیپٹل گیبل جس بہادری، تحمل مزاجی اور ہنرمندی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ وہ اس کی عظیم صلاحیتوں کے عکاس ہیں۔''

kutubistan.blogspot.com

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل کلیئر چینالٹ

اسے فقط اس لئے سکول میں استاد رکھا گیا کہ اسے لڑنا آتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ایک شخص جو لوسیانہ کے ایک سکول میں استاد تھا۔ اس نے ائر فورس میں بھرتی ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی درخواست ان الفاظ کے ساتھ رد کر دی گئی۔ "اس میں ایک کامیاب ہوا باز بننے کی صلاحیتیں موجود نہیں۔"

بعد میں اسی شخص کا شمار دنیا کے بہترین ہوا بازوں میں ہونے لگا۔ اس کا نام چینالٹ ہے۔ میجر جنرل کلیئر چینالٹ' پرل ہاربر کے حملے کے بتیس روز بعد اس کی چین میں مقیم ائر فورس جو رضاکار امریکی ہوا بازوں پر مشتمل تھی اور جو تعداد میں بہت کم تھی۔ اس کے باوجود چینالٹ اس کی مدد سے جاپانیوں کے ہوائی حملہ روکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس نے بہت سے جاپانی جنگی طیارے برما کے جنگلات میں مار گرائے۔ اس کے رضاکار امریکی ہوا بازوں کا نام "اڑن شیر" تھا۔ پرل ہاربر پر حملے کے چھ ماہ بعد کے عرصے میں اتحادی فوجوں نے جاپانیوں پر اگر کوئی فتح حاصل کی تھی' تو وہ فقط چینالٹ کے "اڑن شیروں" کی بدولت تھی۔ جنہوں نے جاپانی طیاروں کو برما سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

ان چھ ماہ میں اتحادیوں کو جن تباہ کن شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ ان چھ ماہ میں جاپانیوں نے فلپائن' ڈچ' ایسٹ انڈیز اور سنگاپور فتح کر لئے اور ہمارے دو نہایت طاقتور جنگی جہاز ڈبو دیئے اور وہ آسٹریلیا پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ان تباہیوں اور شکستوں کے مناظر میں اگر کوئی حوصلہ افزا بات تھی تو وہ یہ تھی کہ چینالٹ اور اس کے "اڑن شیر" جاپانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے اور ان کے ہوائی حملوں کو ناکام بنا رہے تھے۔ انہوں نے ایسی فتوحات حاصل کیں جن کی یاد آج بھی ہمیں حیران و ششدر کر دیتی ہے۔ برما کے آسمان کے نیچے انہوں نے جو تجربے دکھائے' وہ ائر فورس کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تو اس وقت جنرل چینالٹ کے پاس پچاس تربیت

یافتہ اور ایک سو غیر تربیت یافتہ ہوا باز تھے اس کے پاس ہوائی جہازوں کے فالتو پرزوں کی اس قدر کمی تھی کہ ہر ہوائی جنگ کے بعد چینالٹ چینی مزدوروں سے کہتا کہ وہ جنگل میں جا کر گرے ہوئے ٹکڑے اٹھا لائیں تاکہ ان سے وہ اپنے جنگی جہازوں کی مرمت کر سکے۔ جہاں تک پٹرول کا تعلق ہے تو یہ ہندوستان سے اسے پہنچایا جاتا تھا اور یہ اس قدر کمیاب تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر کڑی پابندی رکھی جاتی' جیسے پٹرول نہیں سونا لے جایا جا رہا ہو۔

پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے تین ماہ بعد تک چینالٹ کے "اڑن شیروں" کی تعداد اتنی کم تھی کہ بیس جاپانی ہوا بازوں کے مقابلے میں ایک امریکی ہوا باز ہوتا تھا۔ اور ان کے پاس اتنا تھوڑا بارود تھا کہ ایک منٹ کی فائرنگ سے زیادہ نہ چل سکتا تھا۔ اس کے باوجود اپنے ایک جنگی ہوائی جہاز کے مقابلے میں بیس جاپانی جنگی طیارے تباہ کرتے اور اپنے ایک ہوا باز کے مقابلے میں بانوے (92) جاپانی ہوا باز ہلاک کرتے۔ ہوائی جنگ کا یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جو صدیوں تک قائم رہے گا۔

جاپانی ہوا بازوں کو اپنی پہلی شکست کا تلخ ذائقہ تیس دسمبر 1941ء کو چکھنا پڑا جبکہ انہوں نے برما روڈ پر بمباری کرنے کی کوشش کی۔ پرل ہاربر کے حملے کے فقط سولہ دن بعد۔ اچانک چھ اڑن شیر طیارے جو تین جوڑوں کی شکل میں اڑ رہے تھے۔ بادلوں کو چیرتے ہوئے زمین کی سمت تیز رفتاری سے آئے' اور انہوں نے جاپانی جنگی طیاروں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ اس حملے سے ایک جاپانی جنگی طیارہ بالکل تباہ ہو گیا اور دوسرے کئی جاپانی جنگی طیاروں کو شدید نقصان پہنچا۔ برما میں جاپانی جنگی طیاروں پر اتحادی جنگی طیاروں کا یہ پہلا حملہ تھا ورنہ گزشتہ پانچ برس میں جاپانی جنگی طیارے ہی ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔

یہ فقط آغاز تھا۔ اڑتالیس گھنٹے بعد کرسمس کے دن جاپانی جنگی طیاروں نے رنگون پر بمباری کی۔ جس سے سولہ سو شہری ہلاک ہو گئے۔ اٹھارہ "اڑن شیر" جاپانی جنگی طیاروں کی صفیں چیرتے ہوئے ان میں گھس گئے اور انہوں نے اٹھارہ جاپانی جنگی طیارے تباہ کر دیئے۔ لیکن ان کا اپنا کوئی نقصان نہ ہوا؟

اب اڑن شیروں نے خون کا مزہ چکھ لیا تھا۔ اگلے دن صبح سویرے انہوں نے تھائی لینڈ کے جنگلات میں چھپے ہوئے جاپانی جنگی طیاروں کا ایک سارا یونٹ تباہ کر دیا۔ وہ اس یونٹ پر اس طرح حملہ آور ہوئے کہ اسے اس حملے کا بالکل وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اسی رات انہوں نے دوبارہ حملہ کیا اور ایک دوسرے جاپانی جنگی طیاروں کے یونٹ کو شدید نقصان پہنچایا۔

ٹوکیو میں بیٹھے ہوئے جنگ کے کرتا دھرتا "اڑن شیروں" کے ان حملوں پر دانت پیسنے

لگے۔ چار خونی دنوں میں برما کے آسمان کے نیچے ان کے اتنے جنگی طیارے تباہ ہوئے تھے کہ ایک سال کے اندر ان کا اتنا نقصان نہ ہوا تھا۔

جنرل چینالٹ اور اس کے آدمیوں کو جاپانی ہوائی حملے کا پہلے ہی سے علم ہو جاتا تھا۔ برما کے جنگلوں میں ہزاروں جاپانی سپاہی اپنی ہوائی فوج کے منتظر بیٹھے تھے لیکن جنرل چینالٹ اور اس کے آدمیوں نے یہ ہوائی فوج ان تک نہ پہنچنے دی۔ یہ جنرل چینالٹ اور اس کے "اڑن شیروں" ہی کی ہمت تھی کہ انہوں نے ہندوستان پر جاپان کا حملہ نہ ہونے دیا۔ اگر جاپانی ہندوستان پر حملہ کر دیتے جو وہاں سے فقط چند سو میل دور تھا تو وہ آسانی سے کلکتے پر قابض ہو جاتے۔

میجر جنرل کلینٹر کس قسم کا آدمی ہے؟ جاپانی جنگی جہازوں کے خلاف اس کی ناقابل یقین کامیابی کا کیا راز ہے۔ بچپن میں اس کی تربیت کچھ اس انداز سے ہوئی تھی کہ بہت سے والدین اپنے بچوں کو اس قسم کی تربیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتے جب وہ چار برس کا تھا تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا باپ جو ایک دیہاتی کسان تھا اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک دیہاتی لڑکے میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا فقط یہی طریقہ ہے کہ اسے من مانی کارروائی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا نوجوان کلینٹر بھی جنگلی جانوروں کی طرح آزاد گھومنے پھرنے لگا' وہ کبھی کبھار سکول بھی چلا جاتا۔ لیکن وہاں اسے فقط دو مضامین پسند تھے۔ جغرافیہ اور تاریخ۔

تین کتابی کردار جنہوں نے اس کے کردار کی ساخت اور اس کی قوت خیال کو تیز کرنے میں بے حد مدد دی وہ ڈینئل بون' ٹام سائر اور ہیکل بیری فن کے معرکے تھے۔ ان کرداروں نے اس کے اندر ایک سیمابی ولولہ بیدار کر دیا اور اس نے ڈینئل بون اور ہیکل بیری فن جیسی زندگی گذارنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ بندوق اور مچھلی پکڑنے کا سامان لے کر ہفتہ ہفتہ لاسانہ کے گھنے جنگلات میں غائب رہتا اور شکار پر اپنی گذر اوقات کرتا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ نہیں وہ اپنی جوانی کے دنوں میں عمدہ عمدہ معرکوں کا ذخیرہ جمع کر رہا تھا اور اپنے اندر ان صلاحیتوں کی نشوونما کرنے میں مشغول تھا جن کی بدولت وہ بعد میں ایک بہترین فوجی راہنما بنا۔۔۔۔۔۔ جرات' انفرادیت زود سوچ اور ہر کام میں پہل جیسی صلاحیتیں۔

اس نے شباب کے ابتدائی دور میں ویسٹ پوائنٹ میں بھرتی ہونے کی کوشش کی۔ لیکن ویسٹ پوائنٹ میں بھرتی ہونے کا مطلب نہایت مشکل امتحانات پاس کرنا تھا۔ ان امتحانوں کا

مقابلہ کرنے کے لئے اس نے لاؤسیانہ سٹیٹ یونیورسٹی میں پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن میکسیکو سے ٹڈی دل کے ایک زبردست حملے نے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے والد کی کپاس کی ساری فصل تباہ ہو گئی۔ چینالٹ اپنی روزی خود کمانے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے ہر قسم کے کاروبار میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر اس نے سکول ماسٹر بننے کا ارادہ کر لیا اور اسے ایک سکول میں جگہ مل گئی۔ یہ جگہ اسے اپنی تعلیم کے بل پر نہیں۔ بلکہ اس خوبی کی بنا پر ملی تھی کہ وہ لڑنا جانتا تھا۔ جب وہ لاؤسیانہ سٹیٹ یونیورسٹی میں ایک طالب علم تھا تو یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے دریائے میسی سپی میں ایک جنگی جہاز لنگر انداز ہوا۔ جہاز رانوں نے یونیورسٹی کے طلباء کو باکسنگ کا چیلنج دیا۔ کلیئر نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس وقت یہ بات اس کے وہم و گمان بھی نہ تھی کہ نیوی کا مڈل ویٹ باکسنگ چیمپئن اسی جہاز پر موجود تھا۔ چینالٹ دس راؤنڈ تک اس کا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر اس نے چیمپئن کو چیلنج کیا کہ وہ دستانے اتار کر اس سے مزید دس راؤنڈ لڑے۔ چیمپئن نے انکار کر دیا اور یونیورسٹی کے طلباء فخر سے شور مچانے لگے۔ اس حیرت ناک مقابلے کی خبر تھوڑے ہی دنوں میں دور دور تک پھیل گئی۔ یہ خبر ایک ایسے دیہاتی سکول میں پہنچ گئی جہاں کے لڑکے بڑے گستاخ اور اکھڑ تھے اور وہ اپنے ہر استاد کو مار بھگاتے تھے۔ چینالٹ کو اس سکول میں پڑھانے کے لئے ملازم رکھ لیا گیا اس نے وہاں پہنچتے ہی سکول کے سرغنہ لڑکوں کے ناک توڑ دیئے اور وہ یہ کام کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے انجام دینے میں دوسرے اساتذہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو وہ سکول کی ملازمت ترک کر کے فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو وہ باقاعدہ ائر فورس میں ایک لیفٹیننٹ تھا اس کی نظر اتنی دور رس تھی کہ اسے مستقبل میں ہونے والی جنگوں کی نوعیت معلوم تھی اور وہ وقتاً فوقتاً امریکی ایئر فورس کے نامناسب طریقوں کے خلاف بڑی شد و مد سے احتجاج کرتا رہتا۔ کئی سال کے مطالعے اور تجربے کے بعد اس نے "دفاعی مقصد کا کردار" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ افسران بالا اس کی بے وقت نکتہ چینیوں سے تنگ آ گئے اور انہوں نے اسے ائر فورس سے ریٹائر کر دیا اس وقت وہ چھیالیس برس کا تھا اسے ریٹائر کرنے کی یہ وجہ بتائی گئی کہ جنگی طیاروں کے شور و غل سے اس کے کان بڑی حد تک بہرے ہو چکے ہیں۔

چند ماہ بعد اسے چین میں جنرل چیانگ کائی شک کا ہوائی مشیر بنا دیا گیا۔

1941ء کے موسم گرما میں وہ امریکہ میں آیا اور امریکی ہوا بازوں کو اس بات کی ترغیب

دینے لگا کہ وہ چین میں آکر اس سے مل جائیں۔ ہر ہواباز کی تنخواہ ایک سو بیس پونڈ ماہوار مقرر کی گئی اور اگر کوئی امریکی ہواباز کوئی جاپانی جنگی طیارہ مار گرائے تو اسے چینی حکومت کی طرف سے سو پاؤنڈ بطور انعام ملیں گے ایک سو امریکی ہواباز جنہوں نے ٹھیک طرح سے تربیت بھی حاصل نہ کی تھی۔ اس کے ساتھ چلنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ ساری جاپانی ائر فورس کا مقابلہ کرنے کے لئے فقط ایک سو ہواباز! جنرل چینالٹ نے چین میں جاپانی ہوابازوں کا نفسیاتی تجربہ کرنے میں چار برس گذارے تھے۔ ان سے ان کے لڑنے کے اصول ازبر ہو چکے تھے۔ وہ جاپانی حملے سے پیشتر ہی اپنے آدمیوں کو بتا دیتا کہ جاپانی جنگی طیارے کس طرح حملہ آور ہوں گے اور ان کا مقابلہ کس طرح کرنا مفید ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اڑن شیروں کو زیادہ نقصان نہ اٹھانا پڑتا اور وہ جاپانی ہوائی حملے کو بلکام بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔

وہ اپنے امریکی ہوابازوں کو ہر روز چھ گھنٹے لڑنے کی تربیت دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ جاپان کے زیرو جنگی طیارے امریکہ کے بھاری پی۔ 40 کی نسبت زیادہ تیز اڑتے ہیں۔ اور جلدی مڑ جاتے ہیں لیکن پی 40 زیادہ تیزی سے غوطہ لگاتے تھے اور ان کی بمباری بھی سخت ہوتی تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تربیت دی کہ وہ ٹیم کی شکل میں اوپر نیچے سے حملہ کریں اور کبھی سامنے آکر مقابلہ نہ کریں اور حملہ کرنے کے فوراً بعد واپس چلے آئیں اس نے اپنے آدمیوں کو تنبیہہ کر رکھی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے مت ٹھہریں کہ اب کیا ہو گا۔ ممکن ہے وہی کچھ آپ کے ساتھ ہو جائے۔

چند ہی ماہ میں چینالٹ نے اپنے اڑن شیروں کو ایک بہترین اور حیران کن ایئر فورس میں منتقل کر لیا۔ ایک ایسی فوج جس نے جنوب مشرقی ایشیا میں ساری جاپانی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

امریکی فوج نے 1942ء میں اڑن شیروں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور جنرل چینالٹ کو چین میں ائر فورس کا کمانڈر بنا دیا گیا۔

گلین ایل مارٹن

ایک زمانے میں وہ اپنے گھر کے باورچی خانے میں پتنگیں بنایا کرتا تھا۔
مگر اب وہ فیکٹری میں جنگی طیارے بناتا ہے۔

پندرہ جنوری 1886ء کا واقعہ ہے کہ ریاست اووا کے شہر ویکس برگ میں جنٹا مارٹن نامی ایک خاتون نے ایک خواب دیکھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اڑن مشین کے ذریعے ہوا میں پرواز کر رہی ہے وہ اپنے شہر کے گرداگرد چکر لگا رہی ہے' اور نیچے گلیوں میں اپنے احباب اور رشتہ داروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر اشارے کر رہی ہے اور اسے اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ اس کی طرح وہ لوگ پرواز کرنے سے معذور ہیں۔

رائٹ برادران کی پہلی فضائی پرواز سے سترہ برس پہلے مسز جنٹا مارٹن نے یہ خواب دیکھا تھا۔

عام حالات میں ممکن ہے کہ مسز مارٹن اس خواب پر کوئی توجہ نہ کرتی۔ لیکن وہ جلد ہی ماں بننے والی تھی' اور اس نے لوگوں سے اکثر سنا تھا کہ بعض خواب سچے ہوتے ہیں۔ دو دن بعد جب اس کے ہاں گلین مارٹن پیدا ہوا۔ تو اس نے اپنے خواب کی تشریح اس طرح کی کہ ایک دن اس کا بیٹا اسی کی فضا میں پرواز کرنے لگا۔

اس کہانی کا عجیب و غریب حصہ یہ ہے کہ رائٹ برادران کی اولین فضائی پرواز کے تھوڑے ہی دنوں بعد اس کے لڑکے نے بھی ہوا میں اڑنا سیکھ لیا دراصل امریکہ میں وہ تیسرا آدمی تھا' جس نے خود ساختہ مشین کے ذریعے' فضا میں پرواز کی تھی۔

آجکل مارٹن ہوائی جہازوں کی صنعت میں سب سے نمایاں حیثیت کا مالک ہے' ریاست میری لینڈ میں بالٹی مور کے نزدیک' ایل' مارٹن کمپنی ہوائی جہازوں کی دنیا میں تیسری بڑی کمپنی ہے۔ اس نے فوج کے لئے میروڈر جنگی طیارے' نیوی کے لئے میرنر طیارے اور ہم سب کے لئے بالٹی مور جنگی طیارے تیار کئے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا ہوائی کشتیاں تیار کرنے والا ہے۔ اس کے باوجود عین ممکن تھا کہ گلین مارٹن زندگی میں کبھی ہوائی جہازوں کی

صنعت میں داخل نہ ہوتا' اگر اس کی والدہ یہ محسوس نہ کرتی کہ ایک روز اس کا خواب ضرور سچا نکلے گا۔

جب وہ جوان ہوا تو اس کی والدہ نے اسے اپنے خواب کے متعلق بتایا اور اس نے اپنے بیٹے کے اندر ہوا پر فتح یاب ہونے کے لئے خود اعتمادی پیدا کی' گلین مارٹن نے اپنا لڑکپن ریاست "کنساس" کے جنوب مغرب میں گذارا تھا۔ جہاں ہر وقت ایک تیز ہوا چلتی رہتی ہے۔

جب میں نے اس سے انٹرویو کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ کنساس کی تیز ہواؤں نے اس کے لڑکپن میں بڑا اہم کردار انجام دیا ہے' جب وہ چھ برس کا لڑکا تھا تو ایک روز وہ اپنی والدہ کے بستر کی چادر باہر لے گیا اور اسے اپنی چھوٹی سی پہیہ گاڑی کے ساتھ بادبان کی شکل میں باندھ دیا۔ جب اس چادر میں ہوا بھر گئی تو ہوا اس گاڑی کو قصبے کے گلی کوچوں میں لئے پھرنے لگی۔ بعد میں ایک دن اس نے اپنے پاؤں سے سیکٹوں کا ایک جوڑا باندھا۔ اور گھر کا بنایا ہوا بادبان اپنے ہاتھ میں لے کر برف پر سے پھسلنے لگا۔ وہ اپنے بائیسکل کے لئے بھی بادبان استعمال کرنے لگا۔ مارٹن کا کہنا ہے کہ اس طرح ہوا کی مدد سے چلنے میں اسے بڑا مزہ آتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان دنوں مسز فستا مارٹن نے نفسیات نامی کسی علم کا نام ہرگز نہ سنا ہو گا۔ لیکن جب میں نے ان سے انٹرویو کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کس طرح اپنے بیٹے کے اندر جرات اور خود اعتمادی پیدا کی تھی۔ آجکل کے ماہرین نفسیات یقیناً اس کے استعمال کئے ہوئے طریقوں کو درست کہیں گے اس نے اپنے بیٹے پر ابتدائی عمر ہی سے وہ تمام ذمہ داریاں ڈالنی شروع کر دیں جن کا بوجھ وہ اٹھانے کے قابل تھا۔ جب برف پر سے پھسلنے کے لئے اسے سیکٹوں کے جوڑے کی ضرورت تھی اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ انہیں خرید سکے تو اس کی ماں اسے ترغیب دیتی کہ وہ لوہار کی دوکان پر جا کر اپنے لئے اپنے ہاتھوں سے سیکٹوں کا جوڑا تیار کرے اور وہ ایسا ہی کرتا۔ جب وہ اپنی ماں سے پتنگ خریدنے کے لئے پیسے مانگتا تو اس کی ماں اسے سمجھاتی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے پتنگ بنائے اور وہ ایسا ہی کرتا۔ ایک دفعہ پتنگ بناتے وقت گلین مارٹن نے ایک نئی قسم کی پتنگ بنائی جس کے متعلق اس نے لڑکوں کے ایک رسالے میں پڑھا تھا۔ وہ صندوق نما تھی اس نے یہ پتنگ اپنی والدہ کے قریب بیٹھ کر باورچی خانے کے فرش پر بنائی تھی۔ یہ جان کر اسے

بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس کی پتنگ دوسری پتنگوں کی نسبت سیدھی اور زیادہ اونچی اڑ سکتی ہے۔

اسے اپنے اس معرکے پر اتنا فخر ہوا کہ اس نے پتنگ بازی کا ایک مقابلہ منعقد کیا اور اس میں اول رہا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قصبے کے دوسرے لڑکے بھی اس سے صندوق نما پتنگیں خریدنے لگے۔ ننھا گلین مارٹن جس نے پچاس سال بعد دنیا کی سب سے بڑی اڑن کشتی بنائی تھی۔ اس نے اپنی والدہ کے باورچی خانے میں پتنگیں بنانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ ایک رات میں تین پتنگیں بنا لیتا اور انہیں تین شلنگ کے عوض فروخت کر دیتا۔

اس احساس کے ساتھ ہی اس کی خوش اعتمادی کو پر لگ گئے کہ اسے خدا کی طرف سے مشینیں وغیرہ ایجاد کرنے کا تحفہ ملا ہے۔ وہ ایسے کام کر سکتا ہے' جو دوسرے لڑکوں کے بس سے باہر تھے۔

تیس برس بعد ایک اخباری نمائندے نے مارٹن سے پوچھا کہ اس نے ہوائی جہاز بنانے کا کام کس طرح شروع کیا تھا۔ گلین مارٹن نے جواب دیا۔

"میری والدہ کا مجھ پر بے حد اثر تھا۔ اس نے باورچی خانے میں پتنگیں بنانے کے سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس نے میرے اندر خود اعتمادی کا جذبہ راسخ کیا تھا۔

جب کنساس میں پہلی دفعہ موٹر کاریں آئیں تو گلین مارٹن کے اندر ان کے انجن کو دیکھنے اور سمجھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ اس نے موٹروں کی ایک دوکان میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعد میں جب ان کا کنبہ ریاست کیلی فورنیا کے شہر سانتا آنا میں منتقل ہو گیا تو وہ اپنے علاقے کے لئے فورڈ اور میکسی ول کاروں کی ایجنسی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بیس سال کی عمر تک کاروں کی فروخت اور مرمت سے اس کی سالانہ آمدنی چھ سو سے آٹھ سو پونڈ کے درمیان تھی۔

1905ء میں ایک دن گلین مارٹن نے اخبار میں ایک ایسا مضمون پڑھا جس نے اسے حیران کرنے کے ساتھ مسحور بھی کیا۔ وہ مضمون رائٹ برادران کے متعلق تھا۔ جنہوں نے اپنی ہوائی مشین پر بیٹھ کر ایک سو سیکنڈ تک فضا میں پرواز کی تھی اس مضمون نے اس کے اندر ایک ولولہ بیدار کر دیا اسے ایک دم احساس ہو گیا کی یہ اڑن مشین ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔

وہ اس دن کتنی دیر تک رائٹ برادران کی فضائی پرواز کے متعلق سوچتا رہا اس نے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جیب میں سے اپنی گھڑی نکال کر ایک سو سیکنڈ گردانے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا ''اگر آدمی اب ایک سو سیکنڈ تک ہوا میں ٹھہر سکتا ہے تو ایک ایسا وقت بھی آ جائے گا۔ کہ وہ اڑن مشینوں کی مدد سے پانچ دس گھنٹے ہوا میں پرواز کر سکے گا۔''

چند ماہ بعد جب ایک فنی رسالے میں رائٹ برادران کی اڑن مشین کی تصویر شائع ہوئی تو اسے دیکھ کر اس کے ولولوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس تصویر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نے اپنی والدہ سے کہا۔ ''یہ ذرا بڑی پتنگ ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے اندر انجن نصب ہے۔ میں پتنگیں اور انجن بنا سکتا ہوں۔ لہٰذا میں بھی اسی قسم کا ایک ہوائی جہاز بنا کر فضا میں پرواز کروں گا۔''

''کیوں نہیں میرے بیٹے'' اس کی ماں نے جواب دیا اور اس کے ذہن میں وہ خواب گردش کرنے لگا۔ جو اس نے اپنے بیٹے کی پیدائش سے دو دن قبل دیکھا تھا۔ ''ہاں میرے بیٹے، تم ایسا با آسانی کر سکتے ہو۔''

اس وقت گلین مارٹن کی عمر بیس برس کی تھی۔ فضا میں پرواز کرنے کا خیال اس کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح محیط ہو گیا کہ وہ اپنا سارا وقت اس کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اسے روزی بھی کمانی تھی، دن کے وقت وہ اپنی دوکان پر فورڈ اور میکس ول کی کاریں فروخت کرتا اور رات کو اپنی آرزو کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا۔ سب سے پہلے اس نے ایک بڑی پتنگ بنائی۔ ایسی پتنگ جس میں انسان بخوبی بیٹھ سکے۔ پھر اس نے اس پتنگ میں انجن کے بغیر پرواز کرنا سیکھا۔ کئی ماہ اس قسم کے تجربے کرنے کے بعد اب اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک اصلی جہاز بنائے۔ ایک ایسا جہاز جس میں پٹرول سے چلنے والا انجن نصب ہو لیکن وہ انجن کس طرح بناتا؟ اسے فضائی مشینوں کی سائنس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا اور اس سلسلے میں اس نے کسی قسم کی تربیت حاصل نہ کی تھی۔

وہ کسی قسم کی فنی تربیت کے بغیر ہوائی جہاز بنانے کی کوشش کر رہا تھا اسے مدد کی اتنی زیادہ ضرورت تھی کہ آخر کار اس نے پبلک لائبریری میں جا کر پلوں کی تعمیر کے متعلق کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اسے ہلکی سی امید تھی کہ شاید پلوں پر بوجھ اور دباؤ کا مطالعہ کرنے سے وہ یہ مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ ایک ہوائی جہاز پرواز کرتے وقت ایک انسان اور ایک انسان کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔

گلین مارٹن نے اپنا پہلا ہوائی جہاز 1908ء میں سانتا آنا کے ایک ویران سے چرچ کی

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

عمارت میں تعمیر کیا۔

اس نے دو پونڈ دس شلنگ ماہانہ کرائے پر وہ ویران گرجا لے لیا اس کا باپ اسے دیوانہ خیال کرتا تھا اور اس بات پر شرمسار تھا کہ اس کا بیٹا ہوائی جہاز بنانے کی کوشش میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا تھا۔ جب کہ وہ کاریں فروخت کر کے روپیہ کما سکتا تھا۔ قصبہ کے نوجوان گلین مارٹن کا مذاق اڑاتے۔ لیکن وہ راتوں کے علاوہ اپنی چھٹیوں میں بھی اڑن مشین بنانے میں مصروف تھا۔ ایک دن ایک معمر خاتون نے گلین مارٹن کی ماں سے درخواست کی "مہربانی کر کے اپنے بیٹے کو اس شیطانی کام سے روکیے۔ اگر خدا نے انسانوں کو اڑانا ہوتا تو وہ انہیں پر لگا دیتا۔"

اس کی ماں ہی واحد ہستی تھی۔ جو ہر طرح سے اس کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ اسے اپنا خواب یاد تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا پرواز کرنے میں ضرور کامیاب ہو گا۔ وہ ہر رات اپنے بیٹے کے ہمراہ اس ویران کلیسا میں کام کرتی لوگ آتے اور کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتے کہ وہ پاگل اور احمق کیا کر رہا تھا گلین مارٹن نے کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے ان کے سوراخوں میں روئی ٹھونس دی اس کے باوجود لوگ باز نہ آتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ آخر اس نے لوگوں کو ہٹانے کے لئے ایک چوکیدار رکھ لیا۔

تیرہ ماہ تک گلین مارٹن اور اس کی والدہ ہوائی جہاز بنانے میں مشغول رہے کرسمس اور نئے سال کے دن بھی وہ کام کرتے رہے۔ گلین مارٹن نے ہوا پر قابض ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ ایک خواب کو تعبیر کا لباس پہنانے میں مصروف تھا' وہ کسی لکھ پتی یا بادشاہ سے بھی زیادہ زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا گلین مارٹن نے مجھے بعد میں بتایا کہ وہ تیرہ ماہ جو اس نے ہوائی جہاز بنانے پر صرف کئے' اس کی زندگی کے بہترین دن تھے۔

آخر اس نے اپنے جہاز میں بارہ ہارس پاور کا ایک انجن لگایا۔ اب ہوائی جہاز مکمل ہو چکا تھا۔ آخر گرجے کی ایک دیوار توڑ کر اسے باہر نکالا گیا۔ وہ جولائی 1909ء کی ایک رات تھی گلین مارٹن اور اس کے مددگار ہوائی جہاز کو گھسیٹتے ہوئے گرجے سے باہر سڑک پر لائے اور اسے تین میل دور ایک میدان میں لے گئے جہاں اگلی صبح انہوں نے اس کی آزمائش کرنی تھی۔ اس عجیب و غریب مشین کو وہ دن کے وقت اس لئے سڑک پر نہ لائے تھے کہ مبادا اسے دیکھ کر گھوڑے وغیرہ ڈر جائیں۔

جب یکم اگست 1909ء کی صبح پھوٹ رہی تھی تو گلین مارٹن اپنے اس ہوائی جہاز میں

سوار ہو گیا۔ اس نے انجن سٹارٹ کیا۔ انجن میں سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں اس نے انجن کی طاقت میں مزید اضافہ کر دیا۔ بھدہ، بھاری بھرکم جہاز زور زور سے ہچکولے کھانے لگا۔ پھر ایک معجزے نے جنم لیا۔ جہاز زمین کی زنجیریں توڑ کر ہوا میں اڑنے لگا۔ گلین۔ ایل۔ مارٹن جو ایک زمانے میں اپنی ماں کے قریب بیٹھا پتنگیں بنایا کرتا تھا۔ وہ واقعی ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔

یہ گلین مارٹن ہی تھا۔ جس نے بحیرہ منجمد شمالی کا جائزہ لینے کے لئے سب سے پہلے ہوائی جہاز بنائے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں بھی زیادہ تر اسی کے بنائے ہوئے ہوائی جہاز استعمال کیے گئے۔

گلین مارٹن کی زندگی اس حقیقت کی زندہ مثال ہے کہ اگر انسان اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا رہے تو وہ آخر کامیاب ہو جاتا ہے اس نے ایک دفعہ کہا تھا "اگر آپ زندگی میں کوئی کام کرنے کا فیصلہ کر لیں، اور آپ کے سامنے مشکلات کی بہت سی دیواریں کھڑی ہو جائیں تو پھر بھی اپنے مقصد کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ ایک نہ ایک دن آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔"

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن

ملکہ وکٹوریہ کا پڑپوتا' سب سے سخت جان کمانڈر تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ہزاروں سپاہی ایک ایسے شخص کی قیادت میں مشرق بعید میں لڑے جو شہنشاہ انگلستان کا چچیرا بھائی اور ملکہ وکٹوریہ کا پڑپوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ دوسری جنگ عظیم کا سب سے زیادہ رومانی اور رنگین فوجی افسر تھا۔ اس کا نام ماؤنٹ بیٹن ہے۔ لیکن اس کے یار غار اسے "ڈکی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ویسے اس کا پورا نام لارڈ لوئس فرانسس البرٹ وکٹر نکولاس ماؤنٹ بیٹن ہے۔ وہ جنگ کے دوران میں جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر تھا۔ اس کی کمان کے تحت روئے زمین کا بارہواں حصہ تھا۔

لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن کو یہ کمان اس لئے دی گئی تھی کہ وہ بحری نقل و حمل کا بہترین تجربہ اور مہارت رکھتا ہے۔ جب ماؤنٹ بیٹن کی فوجوں نے اکیاب کے مقام پر جاپانی فوجوں کو شکست دی تو وزارت جنگ کے سیکرٹری سٹمسن نے اسے مبارکباد دی اور جاپانیوں کی اس شکست کو "گہری چوٹ" کا نام دیا۔ اکیاب کے مقام پر جاپانیوں نے اپنی ہوائی فوج کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا اور وہ وہاں سے کلکتہ پر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن اس شکست کے بعد مغرب کی سمت میں جاپانی حملوں کی لہر تھم گئی۔

لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن کے تقرر میں ونسٹن چرچل کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن آپ یہ نہ سوچیں کہ کیوبک کانفرنس نے اسے اتنا بڑا عہدہ فقط اس لئے دیا ہو گا کہ وہ امیر اور خوبصورت تھا اور شاہ برطانیہ کا چچیرا بھائی اور ملکہ وکٹوریہ کا پڑپوتا تھا۔ جب چرچل کسی بڑے فوجی عہدے پر تقرر کے لئے کسی شخص کی سفارش کرتا تو وہ اس بات کی ہرگز پروا نہ کرتا کہ آیا اس نے اپنا لڑکپن محلات میں گزارا تھا۔ لارڈ لائس ماؤنٹ بیٹن کی طرح یا وہ کنساس میں خرگوشوں وغیرہ کا شکار کرتا رہا تھا۔ آئزن ہاور کی طرح۔

یہ صحیح ہے کہ لارڈ لوئس نے جنگ کے ابتدائی دور میں زیادہ لڑائیاں نہ جیتی تھیں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دراصل اس زمانے میں حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ اتحادیوں سے زیادہ فتوحات کی توقع عبث تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تباہ کن حالات میں بڑی جرات مندی سے دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی زیر کمان جنگی بحری جہازوں پر مسلسل کئی کئی دن بمباری ہوتی رہتی دو مختلف موقعوں پر دشمن نے اس کے جہاز سمندر کے نیچے سے تباہ کر دیئے۔ ڈکی ماؤنٹ بیٹن کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ جنگ کے دوران میں سب سے زیادہ بمباری اس کے جہازوں پر ہوئی تھی لیکن اس کی حملہ آورانہ قابلیت اور آتشیں جرات کے متعلق کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔

انگریز کہتے ہیں کہ لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن میں "نیلسن کی جھلک پائی جاتی ہے وہ اس کا موازنہ جنگ ٹریفلگر کے غیر فانی ہیرو لارڈ نیلسن سے کرتے ہیں۔ لارڈ نیلسن جو برطانوی نیوی میں ایک مقدس بزرگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی جنگی جہاز "کیلے" کا کمانڈر تھا تو اس نے کس طرح نیلسن جیسی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔

دشمن کی ایک آب دوز جنگی کشتی نے "کیلے" کو ناکارہ کر دیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اسے بڑی ہمت سے کھینچ کر بندرگاہ میں لایا۔ چھ ماہ اس کی مرمت پر صرف ہوئے۔ جب وہ ٹھیک ہو گیا تو ماؤنٹ بیٹن اسے جنگ کے لئے دوبارہ سمندر میں لے آیا۔ اس دفعہ ایک تارپیڈو نے اس کا انجن خراب کر دیا۔ کیلے کو دوبارہ بندرگاہ تک لانے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن چار دن اور چار راتیں جرمنوں کی آب دوز جنگی کشتیوں اور جنگی ہوائی جہازوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ جرمنی طیارے اس کی چاروں طرف آگ برسا رہے تھے اس مصیبت میں فطرت نے بھی اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ ایک طوفان نے کیلے کو اپنی زد میں لے لیا اور وہ مزید چلنے کے قابل نہ رہا۔ آخر اسے ایک دوسرے جنگی جہاز کے ساتھ باندھ دیا گیا وہ کسی وقت بھی ڈوب سکتا تھا لارڈ لوئس نے تمام جہاز رانوں اور سپاہیوں کو دوسرے جہاز پر منتقل ہونے کا حکم دے دیا۔ وہ اور اس کے ہمراہ چند رضاکار رہ گئے۔ جرمن جنگی ہوائی طیارے اب بھی کیلے کا تعاقب کر رہے تھے۔ اور اسے غرق کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اس کے رضاکار انہیں دور رکھنے کے لئے کیلے کی توپیں مسلسل استعمال کر رہے تھے آخر ماؤنٹ بیٹن اسے بندرگاہ پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک سال بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن پھر اسے میدان جنگ میں لے آیا اس دفعہ پھر اس نے

"نیلسن کی جھلک" کا مظاہرہ کیا۔ یونان اور کریٹے کے جزیرے پر جرمنی تسلط کے تھوڑے دنوں بعد کی یہ بات ہے' وہ اتحادیوں کے لئے حوصلہ شکن اور تاریک دن تھے۔ فضا پر جرمنوں کا قبضہ تھا۔ لیکن سمندر پر اتحادی نیوی ہی قابض تھی۔

اس جنگ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سرتاپا حصہ لیا وہ پانچویں جنگی بیڑے کا کمانڈر تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے جنگی جہاز کیلے پر سے حاصل کے ساتھ ساتھ جرمنی کمین گاہوں پر سخت گولہ باری کی۔ اس کے جنگی جہازوں نے دو جرمن جہاز غرق کر دیئے۔ ان میں سے ایک جہاز سپاہیوں اور دوسرا بارود سے بھرا ہوا تھا۔ کئی گھنٹوں تک جرمن بمبار طیارے ماؤنٹ بیٹن کا جہاز غرق کرنے میں کوشاں رہے۔ ہزاروں بم گرائے گئے لیکن کسی نہ کسی طرح نشانہ خطا ہوتا رہا۔ آخر آٹھ بجے کے فوراً بعد تباہی نے ماؤنٹ بیٹن کے جنگی بیڑے کو گھیر لیا۔ اچانک بادلوں میں سے جرمن غوطہ خور جنگی طیارے نمودار ہوئے اور وہ عین کیلے کے وسط میں ایک بم گرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد کیلے پر تابڑ توڑ بموں کی بارش ہونے لگی۔ لارڈ لوئس کا جہاز بری طرح زخمی ہوا۔ چالیس سیکنڈ کے اندر اندر اس نے سمندر کی تہہ میں بیٹھ جانا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن میں "نیلسن کی جھلک" موجود تھی۔ جب تک کیلے سطح سمندر پر رہا اس کی توپیں دشمن طیاروں پر آگ برساتی رہیں۔ اس نے بلند آواز میں اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ خواہ قیامت ٹوٹ پڑے۔ توپوں سے آگ برساتے رہو۔" چالیس سیکنڈ بعد کیلے سمندر کی تہ میں بیٹھ گیا۔ جہاز کے ساتھ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی سمندر کی لہروں میں چھپ گیا اس نے ہمت دکھائی اور لہروں کو چیرتا ہوا سطح پر آگیا سطح پر آتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کے ڈوبنے والے جہاز کے مستول اس کے قریب سے گزر رہے تھے اور توپوں سے ابھی تک گولے آسمان کی سمت پرواز کر رہے تھے۔ اڑھائی گھنٹوں تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اس کے آدمی سمندر میں جدوجہد کرتے رہے۔ ان کے سروں پر جرمنی جنگی طیارے اڑ رہے تھے اور مشین گنوں سے گولیاں برسا رہے تھے۔ لیکن معجزانہ انداز میں ان کا ایک جنگی جہاز وہاں ان کی مدد کے لئے پہنچ گیا۔

نیو کاورڈ کی بہترین فلم In which we serve کی بنیاد زیادہ تر ماؤنٹ بیٹن کے تجربات پر رکھی گئی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن کا نام پہلے پہل اس وقت مشہور ہوا۔ جب اسے چھاپہ مار دستوں کا لیڈر بنایا گیا تھا۔ یہ چھاپہ مار لڑاکے تقریباً ہر رات باقاعدگی سے فرانس بلجیم اور ہالینڈ کے ساحلوں پر

حملہ کرتے رہتے تھے ہر حملے میں وہ دشمنوں کا بھاری جانی اور مالی نقصان کرتے اور اتحادیوں کے لئے بہت سی اہم اطلاعات جمع کرتے' اتحادیوں کے حوصلے بلند کرنے میں ان چھاپہ مار دستوں کو بھی بڑا دخل ہے۔

جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن چھاپہ مار دستوں کا سربراہ بنا تو اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو کبھی کوئی ایسا کام کرنے کے لئے نہ کہے گا جسے وہ خود پسند نہ کرتا ہو۔ وہ اور اس کے آدمی جرمنوں کے ساتھ دو بدو لڑائی کرتے اور ان سے اسلحہ وغیرہ چھینتے رہتے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان چھاپہ مار دستوں کا فقط راہنما ہی نہ تھا بلکہ اس نے ان جیسی تربیت بھی حاصل کر رکھی تھی۔ وہ تربیت میں اپنی سختی کے سبب مشہور تھا۔ اور آج تک کسی جنگ میں سپاہیوں کو اس قسم کی تربیت نہ دی گئی تھی۔ وہ خاک و خون کے راستوں سے اپنے آدمیوں کی راہنمائی کرتا۔ ایسا کرنا اس کی تربیت کا ایک حصہ تھا۔ اس تربیت کے ابتدائی دور میں اسے سب سے پہلے رائفل اور پوری کٹ اٹھا کر دس فٹ تک نوکیلی تاروں والی زمین پر سے رینگ کر گزرنا پڑتا۔ پھر اسے ایک ندی میں سے گزرنا پڑتا جس کے چاروں طرف بم اور بارود پھٹ رہا ہوتا۔ پھر اسے ایک کھائی میں چھلانگ لگانی پڑتی۔ جس میں گردن تک پانی بھرا ہوتا۔ آگے شعلے بھڑک رہے ہوتے وہ ان شعلوں کی دیوار میں سے گزرتا۔ اس دوران میں ایسے ریکارڈ بجائے جاتے۔ جن میں بم پھٹنے اور جنگ کی دوسری خوفناک آوازیں بھری ہوئی تھیں۔

لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن جنگ کے سپریم کمانڈروں میں سب سے کم عمر تھا۔ جب وہ سپریم کمانڈر بنا تو اس کی عمر پینتالیس برس تھی۔ وہ آئزن ہاور سے دس برس اور جنرل مکارتھر سے اکیس برس چھوٹا تھا۔ اس کے باوجود شمالی افریقہ میں اتحادی فوجیں اتارنے کے سلسلے میں تیار کیا گیا شاندار منصوبہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی قوت فکر کا نتیجہ تھا۔ سسلی اور اٹلی میں بھی فوجیں داخل کرنے میں بھی اس نے بڑی مدد دی تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی زندگی کا دو تہائی حصہ برطانوی نیوی میں گزار چکا ہے۔ وہ تیرہ برس کی عمر میں نیوی میں بھرتی ہوا تھا۔ نیوی میں کام کرنے کا جذبہ اسے ورثے میں ملا تھا۔ بچپن میں بھی وہ کھلونوں کے جنگی جہازوں سے کھیلتا اور اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کے خواب دیکھتا۔ اس کے والد مارکوئس آف ملفورڈ ہیون نے پچاس برس تک برطانوی نیوی کی خدمت کی تھی اور اس نے نیوی میں بلند ترین عہدہ حاصل کیا تھا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کئی برس پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی تہیہ کیا تھا کہ وہ برطانوی نیوی میں نمایاں حیثیت حاصل کر کے رہے گا۔ وہ جانتا تھا کہ نہ تو سفارش اور نہ ہی اس کا شاہی خون اس کی مدد کرے گا۔ اسے فقط اپنی قابلیت اور صلاحیت کے زور پر اپنا مقام پیدا کرنا ہو گا۔ اسی لئے اس نے خود کو تن کوشی اور سخت جانی کی تربیت دی وہ اس قدر مطالعہ اور محنت کرتا کہ ترقی کے ہر امتحان میں اس کا نام سرفہرست ہوتا اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں چار برس گزارے اور وہاں سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی سند حاصل کی۔ اس نے ریڈیو کے ذریعے خفیہ پیغاموں کے سلسلے میں نمایاں کام کر رکھا ہے اور بہت سے اشارے اس نے خود بھی ایجاد کئے ہیں۔ وہ دو برس تک نیوی کے سگنل سکول میں استاد بھی رہ چکے ہیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا یہ اصول تھا کہ کسی فوجی حملے سے پہلے وہ دیکھ لیتا کہ اس میں کسی قسم کی خامی تو نہیں رہ گئی تھی۔ اگر کسی حملے میں کوئی خامی رہ جاتی تو وہ اسے دوسرے حملے میں دور کرنے کا تہیہ کر لیتا۔ ناروے کی ایک بندرگاہ پر ایک حملے کے بعد اس نے اپنے آدمی جمع کئے اور ان سے کہا "ہم نے آٹھ بج کر تیس منٹ پر حملہ کرنا تھا۔ لیکن مجھے اپنا پہلا آدمی بندرگاہ کے قریب آٹھ بج کر اکتیس منٹ پر دکھائی دیا تھا۔" کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟ نہیں جناب! وہ جانتا تھا کہ حملے میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔

O

KUTUBISTANBLOGSPOT.COM

باب ہوپ

وہ زندگی میں فقط ایک چیز کے متعلق سنجیدگی سے سوچتا ہے---- اور
وہ ہے ایک بھرپور قہقہہ!

جس شخص نے لوگوں کو ہنسانے کے لئے اسی ہزار میل کا سفر طے کیا وہ بینگ کراسے کا ہمسایہ باب ہوپ ہے۔ اسی ہزار میل! یہ طویل سفر باب ہوپ نے طے کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں فقط فوجیوں کو ہنسانے اور ان کے مغموم دلوں کو تسلی دینے کے لئے۔

جب اس کی کمپنی الجزائر میں تھی تو اس پر بمباری ہوئی۔ اٹلی میں وہ ایک ہوائی اڈے اور بارود کے ایک گودام کے درمیان میں پھنس گئے۔ ان دونوں پر زبردست بمباری ہو رہی تھی۔ وہ ٹرکوں، ٹینکوں اور جیپوں کی مدد سے ہر اس جگہ پہنچ کر اپنے مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہا۔ جہاں کہیں بھی اس کی ضرورت محسوس کر کے اسے بلایا گیا۔

ایک دفعہ باب ہوپ کو معلوم ہوا کہ چھ سو سپاہیوں کا ایک گروہ دس میل طے کر کے اس کا شو دیکھنے آ رہا تھا۔ لیکن راستے میں دشمن کی دیوار حائل ہو گئی اور بیچارے فوجی مایوس واپس چلے گئے۔ شو کے اختتام میں ابھی تالیوں کی گونج مدھم بھی نہ پڑی تھی کہ باب ہوپ نے اپنی کمپنی کو جیپوں میں لادا اور ان سپاہیوں کی تلاش میں چل نکلا۔ سپاہیوں کو تلاش کر کے اس نے دشمن کا خطرہ مول لیتے ہوئے اسی رات بارش میں ان سپاہیوں کے سامنے دوبارہ اپنا شو دہرایا۔

کوئی دوسرا ایکٹر باب ہوپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ پہلا مزاحیہ اداکار تھا جس نے مزاح کو جنگ کی ایک ضرورت سمجھتے ہوئے اسے محاذ جنگ تک پہنچایا۔ فقط مختلف محاذ جنگ ہی پر نہیں بلکہ تربیتی کیمپوں کو بھی وہ کشت زعفران بناتا رہا۔

الاسکا میں فوج کی نقل و حمل کا انچارج لیفٹیننٹ جنرل سائمن 'بی' بکنر تھا۔ ایک دن بکنر کو ایک عجیب و غریب تار ملا۔ تار میں لکھا تھا "ہم گاتے رقص کرتے اور لطیفے سناتے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہیں۔ کیا ہم آپ کے حلقے میں اپنا شو دکھا سکتے ہیں۔ نیچے باب ہوپ کا نام لکھا تھا۔"

جب جواب "ہاں" میں آیا تو باب ہوپ اپنی کمپنی لے کر الاسکا کے اس تربیتی کیمپ کی سمت چل پڑا۔ وہاں اسے تھیٹر کی عارضی عمارت تیار کرنے میں اس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ شاہی محل میں داخل ہونا اس سے زیادہ آسان ہو گا۔

امریکہ کے تمام مزاحیہ اداکاروں میں باب ہوپ کا نام سرفہرست آتا ہے اس کے باوجود پیدائشی اعتبار سے وہ انگریز ہے۔ ابھی وہ چھوٹا تھا کہ اس کے والدین اسے کلیولینڈ لے گئے۔ سات برس کی عمر میں اس نے تھیٹر کا اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک دفعہ مقامی گرجے میں ایک میلہ لگا۔ باب ہوپ ان دنوں دس بارہ برس کا تھا۔ وہ بھی ایک نظم سنانے کے لئے تماشائیوں کے سامنے آیا' لیکن اس نے نظم کی سطریں اوپر نیچے کر دیں اور اس کا تلفظ اتنا غلط تھا کہ لوگ بلند آواز میں اس کا مذاق اڑانے لگے۔ اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو شرم اور ہتک کے مارے بھاگ کھڑا ہوتا لیکن باب ہوپ تماشائیوں کے شور و غوغا سے اور بھی چہکا اور انہیں جھک کر سلام کرنے لگا۔ جیسے وہ اس کی دل شکنی کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہوں۔

بارہ برس بعد جب وہ موٹروں کے ایک کارخانے میں کام کیا کرتا تھا تو اس وقت تک تھیٹر میں کام کرنے کے خیال اور جادو نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا ایک دفعہ اسے کارخانے کے منیجر کے کمرے میں املا لکھنے والی مشین نظر آ گئی۔ اسے دیکھ کر باب ہوپ کی رال ٹپک پڑی اور وہ اسے استعمال کرنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ اس کی رات کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔ دوسری رات کارخانے میں آتے ہی دوسرے ہم عمر لڑکے جمع کئے اور وہ سب مل کر املا لکھنے والی مشین کے سامنے آج رات شہر میں گرما گرم شو ہو گا۔" گانے لگے۔ جب یہ گانا انہوں نے ریکارڈ کر لیا تو انہوں نے املا لکھنے والی مشین سے وہ سلنڈر اتار کر رکھ دیا۔ اب وہ ہر رات کو وہی سلنڈر دوبارہ مشین پر چڑھا کر گانا سنتے رہتے ایک رات وہ سلنڈر اتارنا بھول گئے اور صبح جب منیجر دفتر میں آیا۔ تو آج رات شہر میں گرما گرم شو ہو گا۔" نے اس کا استقبال کیا۔ دوسرے دن باب ہوپ کو ملازمت سے چھٹی مل چکی تھی۔

آخر اسے احساس ہو گیا کہ وہ تھیٹر میں کام کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک تھیٹر میں گانے اور رقص کرنے لگا۔ اس کام میں اس کا ایک دوسرا ساتھی بھی ہوتا تھا۔ اگلے چند

برس وہ یہی کام کرتا رہا۔ لیکن کسی کامیابی کے بغیر اس دوران میں اس کی گذر اوقات بھی بمشکل ہوتی۔ اس کا کھانا اس قدر ناقص ہوتا کہ آج بھی اس کے خیال سے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔

لیکن جب اس کی زندگی میں انقلاب آیا تو یہ محض ایک اتفاق تھا۔ ایک رات تھیٹر کے مالک نے باب ہوپ سے کہا کہ وہ باہر سٹیج پر جا کر تماشائیوں کے سامنے اعلان کر دے کہ اگلے ہفتے وہ ایک نیا کھیل پیش کریں گے۔ باب ہوپ نے ہجوم سے آ کر کہا۔ "مہربانو! تھیٹر کے انتظامیہ نے مجھے آپ کے سامنے یہ یقین دلانے کے لئے بھیجا ہے کہ اگلے ہفتے وہ ایک اچھا کھیل پیش کریں گے اور اس کھیل کا نام۔۔۔۔۔" ہجوم نے اسے جملہ بھی ختم نہ کرنے دیا۔ وہ شور مچانے اور تالیاں پیٹنے لگے دس منٹ تک یہ ہنگامہ بپا رہا۔ باب ہوپ بھی جوابی کارروائی میں مشغول رہا۔ آخر جب وہ سٹیج سے واپس آیا تو منیجر نے اس سے کہا۔ "باب ہوپ!" تم گانے تم رقص کرنے میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو۔ مزاحیہ کردار تمہارے لئے بہتر ثابت ہو گا۔" یہ بات باب ہوپ کے دل کو لگی اور وہ مزاحیہ کردار انجام دینے لگا۔ اس وقت سے اب تک وہ یہی کچھ کر رہا ہے اور اس نے اپنے تماشائیوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔

آج کل وہ 80٬000 پونڈ سالانہ کما رہا ہے' ہالی وڈ والے جانتے ہیں کہ اسے روپیہ کمانے اور اسے سنبھالنے کا گر آتا ہے۔ چند برس پہلے کی بات ہے کہ مختلف کاروبار میں سرمایہ لگانے کے متعلق مشورہ دینے والا ایک دلال اس بنک کے منیجر کے پاس گیا جہاں باب ہوپ کا سب سے زیادہ روپیہ جمع تھا۔ اس نے بنک کے منیجر سے کہا۔ "آپ باب ہوپ سے میری سفارش کریں کہ وہ مجھے بطور کاروباری مشیر رکھ لے۔ میں اسے بہت سے مفید مشورے دے سکتا ہوں" منیجر نے جواب دیا۔ میں باب ہوپ کو گزشتہ تین برس سے جانتا ہوں۔ اگر آپ اسے کاروباری مشیر مقرر کر لیں تو آپ کی حالت یقیناً بہتر ہو سکتی ہے۔"

زندگی میں فقط ایک موقع باب ہوپ نے ہاتھ سے جانے دیا۔ یہ 1930ء کا ذکر ہے۔ جب اسے ریڈیو پر ملازمت مل رہی تھی۔ باب ہوپ نے ان الفاظ کے ساتھ انکار کر دیا۔ "میں اپنا وقت ضائع کرنے پر تیار نہیں ریڈیو زیادہ دیر تک نہ چلے گا۔"

پانچ برس بعد جب ریڈیو عوام میں بے حد مقبول ہو چکا تھا تو باب ہوپ کو ایک دوسرا

موقع ملا۔ اس وقت وہ ریڈیو کی دنیا میں اپنا نام پیدا کرنے کا اتنا خواہش مند تھا کہ وہ ساری رات اپنے سکرپٹ کی نوک پلک سنوارنے میں مشغول رہا لیکن جیسا کہ باب ہوپ کہا کرتا ہے۔ "تھیٹر میں کوئی خالی کرسی دیکھ کر مجھ میں سٹیج کا خوف دور کرنا آتا ہے۔ لہٰذا وہ ریڈیو کے خالی سٹوڈیو میں کھیل دکھانے کے لئے تیار نہ تھا۔"

اس سے ملحقہ سٹوڈیو میں چارلی میکارتھی اور ایڈگر برگن اپنا کھیل پیش کر رہے تھے اور سارا سٹوڈیو لوگوں سے بھرا تھا۔ باب ہوپ نے ریڈیو کے ایک ملازم کو تھوڑی سی رشوت دی اور ایڈگر برگن اور اپنے سٹوڈیو کے درمیان والا دروازہ کھلوا لیا' جب ان کا کھیل ختم ہو گیا اور لوگ باہر نکلنے لگے تو باب ہوپ ان سے کہنے لگا۔ "اس طرف' اس طرف" اور وہ سب کو اپنے سٹوڈیو میں لے آیا۔ پھر اس نے مقررہ وقت پر لوگوں کے سامنے۔اور ریڈیو سننے والوں کے لئے ایسے کھیل کا مظاہرہ کیا کہ لوگ ہنسی کے مارے دیوانے ہو گئے۔

باب ہوپ پر حقیقی زندگی میں بھی ایک سیمابی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اسے ایک جگہ بیٹھنے سے نفرت ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں اتنے کام کرتا ہے کہ بہت سے لوگ اسے "پھرتی کا مکمل مجسمہ" کہتے ہیں۔ اس نے اپنے ٹیلی فون کے ساتھ ایک لمبی ڈوری باندھ رکھی ہے وہ ٹیلی فون پر باتیں کرتے۔ وقت بھی کمرے میں چلتا پھرتا رہتا ہے اس نے کبھی کوئی کتاب ایک نشست میں ختم نہیں کی۔ لیکن چھوٹی چھوٹی مزاحیہ کہانیاں اور ڈرامے وہ بڑی رغبت سے پڑھتا ہے۔

اس کے وہ بے ساختہ اور برجستہ مزاحیہ جملے جن پر لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے ہیں اس کی ذہنی مشقت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس کا سب سے قیمتی خزانہ لطیفوں وغیرہ کی وہ فائلیں ہیں۔ جنہیں اس نے اپنی خواب گاہ سے ملحقہ کمرے میں بڑی احتیاط سے رکھا ہوا ہے اور اس کمرے کو فقط وہی کھولتا ہے۔ اس کے علاوہ چھ مزاحیہ ادیب ہر وقت اس کے لئے نئے نئے لطیفے اور مزاحیہ کھیل لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔

دوسرے اچھے اداکاروں کی طرح باب ہوپ بھی توہم پرست واقع ہوا ہے' جب پیرا مونٹ سٹوڈیوز نے اس کے لئے ایک نیا ڈریسنگ روم بنانا چاہا تو اس نے وہ ڈریسنگ روم چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جس میں اس نے اپنی پہلی فلم کے وقت لباس وغیرہ تبدیل کیا تھا۔ وہ اتنا چھوٹا اور تنگ ہے کہ دو آدمی بمشکل اس میں بیٹھ سکتے ہیں۔ اب اس ڈریسنگ روم

کے اردگرد بہت سے خوبصورت اور کشادہ ڈریسنگ روم بن گئے ہیں۔ مگر باب ہوپ اب بھی وہی پرانا ڈریسنگ روم استعمال کرتا ہے۔

اسے امید ہے کہ وہ ایک دن ہالی وڈ کا نمایاں امتیاز آسکر حاصل کر کے رہے گا خواہ اسے آسکر حاصل ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ جنگ کے دوران میں محاذ جنگ پر لڑنے والے ہزاروں سپاہیوں کے دلوں میں اس نے اولیں جگہ ضرور حاصل کر رکھی ہے۔ اور آج بھی لاکھوں لوگوں کو ہنسانے کا فرض ادا کر رہا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے "میں زندگی میں فقط ایک چیز کے متعلق سنجیدگی سے سوچتا ہوں۔۔۔۔ "اور وہ ہے ایک قہقہہ"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کیپٹن ایڈی ریکن بیکر

وہ دو جنگوں کا ہیرو ہے۔ اس کے باوجود کسی زمانے میں وہ اس قدر شرمیلا تھا کہ کسی کو سلام کرنے سے گھبراتا تھا۔

ایسٹرن ائر لائنز کا صدر اور جنرل منیجر کیپٹن ایڈی ریکن بیکر نے ایک ایسی زندگی بسر کی ہے جو آتشیں ڈرامے اور ولولہ انگیز مہمات سے بھرپور ہے ایسے واقعات جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کا بہترین اور مشہور ترین ریسنگ ڈرائیور کی حیثیت سے ایڈی ریکن بیکر نے کئی دفعہ موت کا سامنا کیا ہے۔ اس کی ریسنگ کار بار بار ہوا میں گزوں اچھل کر الٹ جاتی رہی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں وہ بہترین جنگی ہوا باز تصور کیا گیا تھا۔ وہ ہوائی جنگوں میں کئی دفعہ بال بال موت کے منہ سے بچا تھا۔ 1941ء میں ایک ہوائی حادثے میں وہ تقریباً ہلاک ہو چکا تھا۔ شدید زخموں کے باوجود جن کے سبب وہ کئی ہفتے زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ وہ امدادی پارٹی کے رکنوں کو بذات خود دوسرے زخمیوں کی طبی اور دوسری امداد کے متعلق ہدایات دیتا رہا۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ 1942ء میں جب اس کا ہوائی جہاز بحر منجمد شمالی میں گر پڑا تھا تو وہ اور اس کے چھ ساتھی بھوک' پیاس اور سردی سے تقریباً ہلاک ہو چکے تھے۔ اور وہ تین ہفتوں تک ربڑ کے تختوں پر یاس کے عالم میں سمندر میں ٹھٹھرتے رہے تھے۔

ایڈی ریکن بیکر کی داستان حیات کا عجیب و غریب حصہ اب شروع ہوتا ہے۔ جب میں نے اس سے انٹرویو کیا تو اس نے مجھ سے کہا "انسان کو موت سے ڈرنا نہ چاہیے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ موت سے میرا کئی دفعہ سامنا ہو چکا ہے۔ مرنا واقعی ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ زندگی کا آسان ترین تجربہ۔"

آج کل ایڈی ریکن بیکر کو دنیا کا بہادر ترین شخص تصور کیا جاتا ہے لیکن بچپن میں وہ اس قدر شرمیلا اور منکسر مزاج ہوتا تھا کہ ہمسایوں کو "گڈ مارننگ" کہنے سے بچنے کے لئے سر جھکا کر سڑک کی جانب ہو جاتا۔ آخر اسے احساس ہو گیا کہ اگر وہ زندگی میں کامیابی حاصل

کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے شرمیلے پن پر قابو پانا ہو گا۔ لہٰذا وہ خود کو جرات مندانہ کاموں پر مجبور کرنے لگا وہ لڑکوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے اس گروہ میں اس قدر ولولہ بھر دیا اور انہیں اتنے نئے نئے خیالات سمجھائے کہ جلد ہی ان کا لیڈر بن گیا۔

پھر ایک المیے نے اسے آن لیا۔ ایک پل کی تعمیر کے دوران میں اچانک اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور ایڈی ریکن بیکر کو مجبوراً یہ مشن ترک کر کے سات افراد پر مشتمل اپنے کنبے کے اخراجات چلانے کے لئے ملازمت کرنی پڑی سب سے پہلے اسے شیشے کا سامان بنانے والی ایک فیکٹری میں رات کی ملازمت ملی۔ اسے بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا۔

فیکٹری اور اس کے گھر کا درمیانی فاصلہ سات میل تھا۔ وہ ٹرام کا کرایہ بچانے کے لئے ہر روز چودہ میل پیدل سفر کرتا اور اس طرح بچایا ہوا کرایہ بھی اپنی والدہ کو دے دیتا۔

وہاں سے کام چھوڑنے کے بعد وہ جوتے بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ اور پھر وہاں سے مشینوں کے ایک کارخانے میں چلا گیا لیکن اسے ان تمام کاموں سے نفرت تھی۔ وہ حقیقت میں ایک فنکار بننا چاہتا تھا۔ وہ ایک آرٹ سکول میں رات کے وقت تعلیم حاصل کرنے لگا۔ پھر ایک دن ایک کتبہ فروش اس کی والدہ کے پاس ایک کتبہ فروخت کرنے کے لئے آیا وہ کتبہ اس نے اپنے شوہر کی قبر پر نصب کرنا تھا۔

جب کتبہ فروش اس کی والدہ سے باتیں کر رہا تھا تو ایڈی ریکن بیکر کا دل شدت جذبات سے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ خدا نے اسے ایک موقع مہیا کیا تھا۔ وہ کیوں نہ کتبے کے پتھر صاف کرنے اور انہیں چمکانے کی ملازمت اختیار کرے اس طرح اسے روزی کمانے کے ساتھ ساتھ اپنے شوق کی تکمیل کا موقع بھی ملتا رہے گا۔ لہٰذا ایڈی نے کتبہ فروش کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے والد کے سرہانے نصب کتبے کے الفاظ بھی ایڈی ہی کے چمکائے ہوئے ہیں۔

لیکن ایک سال بعد ایڈی ریکن بیکر کو یہ کام بھی چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ پتھروں سے اڑنے والی گرد اس کے پھیپھڑوں میں جمع ہونے لگی تھی اس کی والدہ ڈر گئی کہ کہیں وہ تپ دق کا شکار نہ ہو جائے۔

پھر ایک دن جب وہ چودہ برس کا تھا۔ ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے اس کی ساری زندگی بدل دی۔ ایک صبح اس نے دیکھا کہ بازار میں گھوڑوں کے بغیر ایک گاڑی شور مچاتی بھاگی جا رہی تھی۔ وہ ایک کار تھی جو دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ ”میں بازار میں اس کار کے تعاقب میں بھاگا ایڈی نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ میرے دل میں جذبات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ کاروں کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنے کے لئے میں اتنا بے چین ہو گیا کہ جونہی ہمارے شہر میں موٹر کاروں کی پہلی دکان کھلی، میں وہاں ملازم ہو گیا۔ وہ دکان کیا تھی۔ لکڑی کا بنا ہوا ایک احاطہ سا تھا۔ اس میں تین کاریں سما سکتی تھیں، جب دکان کا مالک باہر چلا جاتا تو میں کار چلانا سیکھنا شروع کر دیتا۔"

آخر اس نے خود موٹر کاریں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی مالی حالت اسے اوزار وغیرہ خریدنے کی اجازت نہ دیتی تھی، لہٰذا اوزار بھی اس نے خود ہی بنائے۔ اس نے گھر کے عقب میں اپنی ورکشاپ کھول لی۔ چند ماہ کے اندر وہ ایسا انجن بنانے میں کامیاب ہو گیا جو واقعی بھاگتا تھا۔ اس نے عملی طور پر ایک کار کا ڈھانچہ بھی تیار کر لیا تھا کہ اچانک اس کے شہر میں موٹروں کی ایک فیکٹری قائم ہو گئی۔

ایڈی ریکن بیکر نے اس فیکٹری میں ملازمت حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ وہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے آٹھ ماہ تک ہر اتوار کی صبح فیکٹری میں جاتا رہا مگر ہر دفعہ اسے مایوس واپس آنا پڑا۔ کوئی عام لڑکا ہوتا، تو ہمت ہار بیٹھتا، لیکن ایڈی ریکن بیکر اپنی دھن کا پکا نکلا۔ وہ فیکٹری میں کام کرنے کا اتنا مشتاق تھا کہ ایک صبح وہ وہاں گیا اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر جھاڑو اٹھا کر زمین پر سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے صاف کرنے لگا۔ فیکٹری کا مالک یہ دیکھ کر حیران رہ گیا "میں یہاں ملازمت حاصل کر کے رہوں گا۔" ایڈی ریکن بیکر نے کہا "خواہ آپ مجھے تنخواہ دیں یا نہ دیں۔"

ذرا مستقل مزاجی اور ولولہ انگیزی ملاحظہ فرمائیں۔ ایڈی ریکن بیکر کو اپنے گوہر مقصود کی خبر تھی اور وہ اندھا دھند اس کے پیچھے ہو لیا تھا۔ فیکٹری کے مالک نے اسے چھوٹے موٹے کام کرنے کے لئے معمولی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ایک دن دوپہر کے وقت جب فیکٹری کا مالک فیکٹری میں داخل ہوا تو ایک بات دیکھ کر اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ کاریگر دوپہر کے وقفے کے دوران میں کھانا کھانے سے فارغ ہو کر گپیں ہانکنے اور تاش وغیرہ کھیلنے میں مصروف تھے۔ لیکن ایڈی ریکن بیکر سب سے الگ ایک گوشے میں بیٹھا مکینیکل انجینئرنگ کے ایک کورس کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا۔ مالک اس سے بڑا متاثر ہوا۔ دو ہفتے بعد اس نے چودہ سالہ لڑکے کو فیکٹری کے انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں رکھ لیا اور اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی۔

ریکن بیکر نے مجھ سے کہا۔ "سکول میں میں نے ساتویں جماعت تک بھی تعلیم نہ پائی تھی۔ اگر میں خط و کتابت کے ذریعے سے مکینیکل انجینئرنگ کا کورس نہ پڑھتا۔ اگر

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اپنے فالتو وقت میں میں خود کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کرتا تو میں زندگی میں ہرگز اتنی ترقی نہ کر سکتا۔"

اس کے بعد اس نے ترقی کے منازل بڑی سرعت سے طے کئے۔ ورک مین۔ فورمین۔ اسسٹنٹ انجینئر۔ سیلزمین۔ برانچ منیجر۔

جب تیز زندگی گزارنے اور معرکے سر کرنے کی خواہش اس کا خون گرمانے لگی۔ کاروں کی دوڑ میں حصہ لینے اور اس میدان میں نام پیدا کرنے کے جذبے نے اس کے دل کو موہ لیا۔ پچیس برس کی عمر میں ایڈی ریکن بیکر کا شمار بہترین ریسنگ ڈرائیوروں میں ہونے لگا۔

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ایڈی ریکن بیکر کاروں کی دنیا میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جنرل پرشنگ کے سٹاف ڈرائیور کی حیثیت سے فرانس گیا۔ لیکن فوجوں کے عقب میں ایک جرنیل کی کار چلانا ایک ایسا سست کام تھا۔ جو ایڈی کی سیمابی کیفیت کے منافی تھا۔ وہ میدان عمل میں اپنے جوہر دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اسے موقع مل گیا۔ فقط پانچ ہفتوں کی ہوائی تربیت کے بعد اسے پائلٹ بنا دیا گیا۔ چند ماہ کے اندر اس نے دشمنوں پر چھبیس فتوحات حاصل کیں اور جنگ کے بہادروں میں اس کا نام سرفہرست دکھائی دینے لگا۔

جنگ کے اختتام پر جب وہ نیویارک میں آیا تو کاروں کے تاجروں نے اس کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ اس کے شہر کے لوگوں نے روپیہ جمع کر کے اس کے لئے ایک بہت بڑا مکان خریدا۔ جب وہ ایک دلہن کی طرح سجی ہوئی کار میں لاس اینجلز کے بازاروں میں سے گزر رہا تھا۔ تو لاکھوں لوگ تالیاں بجا بجا کر اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

لیکن ایڈی ریکن بیکر نے مجھے جو سب سے زیادہ حیرت ناک بات بتائی وہ جنگ کے چار سال بعد جرمن میں اس کے اور ہرمان جورنگ کے درمیان گفتگو تھی۔ ایڈی ریکن بیکر اور اس کی بیوی ماہ عسل منانے کے لئے یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ جونہی وہ برلن پہنچے۔ جرمن کے چار نامور ہوا باز اسے ملنے کے لئے آئے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ایڈی اور ان کے درمیان سخت مقابلہ رہا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ چار برس پہلے کی بات تھی اور سپاہی ایک دوسرے کے خلاف دل میں ہرگز بغض نہیں رکھتے۔ لہٰذا وہ چاروں ہوا باز ایڈی سے ملنے آئے اور وہ ایک دوسرے سے پرانے دوستوں کی طرح بڑے تپاک سے ملے۔

ان میں سے ایک ہوا باز کا نام ہرمان جورنگ تھا۔ جس نے بعد میں ہٹلر کی ایئر فورس کو

تشکیل دی تھی۔ جورنگ نے ایڈی ریکن بیکر سے کہا (یاد رہے کہ یہ گفتگو جرمن کی شکست کے فقط چار برس بعد کا واقعہ ہے) "جرمنی کے سارے مستقبل کا دارومدار اس کی ہوائی فوج پر ہے اور ہم فقط ایئر فورس کے بل پر جرمنی کو دوبارہ آزاد کرائیں گے۔ اس سلسلے میں ہم تین کام کریں گے پہلا ہم جرمنی کے تمام نوجوانوں کو۔۔۔۔۔ ہوا بازی بطور ایک سپورٹ کے سکھائیں گے۔ اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہم تجارتی ہوائی سروس شروع کریں گے۔ اور پھر چند برس بعد جب جمہوری ملک جنگ سے تنگ آ جائیں گے تو ہم فوجی ایئر فورس کا ایک ڈھانچہ تیار کریں گے پھر ہم ان تینوں کو ملا کر اپنی ایئر فورس کو مضبوط کرتے جائیں گے، جب فرانس اور برطانیہ سوئے ہوئے اور بے خبر ہوں گے تو ہم حملہ کر کے اگلی جنگ جیت لیں گے۔

یاد رہے کہ جورنگ نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے، جب جرمنی کمزور اور بے بس تھا۔ یہ الفاظ جورنگ نے اس زمانے میں کہے تھے، جب ہٹلر کا نام اس کی پارٹی سے باہر کوئی نہ جانتا تھا۔ اس وقت جرمنی کثرت زر اور خطرناک قسم کے مالی بحران میں سے گزر رہا تھا۔

1943ء میں ایڈی ریکن بیکر نے ایک تنبیہہ جاری کی تھی۔ جب تک ہم جرمن اور جاپان میں اپنی ہوائی فوج نہ رکھیں گے، جب تک جرمن میں دیوانے حکمرانوں کی موجودہ نسل ختم نہ ہو گی اور ان کی جگہ دوسری نسل نہ لے لے گی۔ جو جمہوریت کا صحیح مطلب نہ سمجھی ہو، جب تک ہم جرمن اور جاپان کو ہوائی جہاز ٹینک اور آب دوز جنگی کشتیاں بنانے سے باز نہ رکھیں گے، یہ دونوں دوبارہ مسلح ہو کر ہم پر پھر سے حملہ آور ہونے سے باز نہ آئیں گے اور ہمارے نوجوان پھر یورپ اور ایشیا کے میدانوں میں ہلاک ہوں گے۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جون بیری مور

وہ ہر روز ایک ہزار پونڈ کماتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے پالتو گدھ کے لئے رات کے وقت گندگی کے ڈبوں میں سے مردار تلاش کیا کرتا!

1876ء کے موسم گرما کے ایک گرم دن کو ایک نوجوان انگریز نیویارک کی پرانی ہوف مین ہاؤس بار میں داخل ہوا اور اس نے بیرے کو برف کے بغیر وسکی اور سوڈا لانے کے لئے کہا۔ بار میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ یہ کیسا نوجوان ہے۔ جو سخت گرمی میں بھی برف کے بغیر وسکی اور سوڈا پی رہا ہے وہ اس کے ریشمی ہیٹ۔ فیشن ایبل عینک اور خالص آکسفورڈ جیسے لہجے سے لطف اندوز ہونے لگے ان میں سے ایک نوجوان اس نوجوان انگریز کا مذاق اڑانے کے ارادے سے آگے بڑھا اور وہ اپنی ایک آنکھ پر چاندی کا ایک سکہ جما کر آگے کی سمت جھکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ میرے خیال میں برف کے بغیر وسکی اور سوڈا ایک انگریز ہی پی سکتا ہے۔

اس امریکی نوجوان کو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ فیشن ایبل انگریز نوجوان کالج کے دنوں میں برطانیہ کا لائٹ ویٹ باکسنگ چیمپئن رہ چکا تھا وہ اس بات سے ناواقف تھا۔ مگر اب اچانک اور ڈرامائی انداز میں یہ راز اس پر منکشف ہونے والا تھا۔ اس انگریز نوجوان نے احتیاط سے اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھی اور ریشمی ہیٹ کو سر پر زیادہ مضبوطی سے جماتے ہوئے اس امریکی نوجوان سے مخاطب ہوا "جناب من! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ انگریز اس کے علاوہ اور کیا کچھ کر سکتا ہے۔" اور پھر اس نے اس امریکی نوجوان کے جبڑے پر ایک زبردست مکہ جما دیا۔ جب پانچ منٹ بعد اس امریکی نوجوان کو ہوش آیا۔ تو اس نے اٹھ کر اس انگریز نوجوان سے مصافحہ کیا اور بار میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کے لئے وسکی لانے کا حکم دیا۔ برف کے بغیر وسکی۔ بار کے تمام لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔

اس ریشمی ہیٹ والے انگریز نوجوان نے بعد میں امریکہ کے تھیٹر کی تاریخ میں اپنے

لئے مستقل جگہ بنائی تھی۔ اس کا نام بیری مور تھا۔ مارائس بیری مور ایتھل' لائنل اور جون بیری مور کا والد۔

بیسویں صدی میں بیری مور کنبہ تھیٹر کی دنیا میں بے حد مشہور ہوا ہے وہ فقط براڈوے کے سٹیج پر ہی نامور ستارے نہ تھے بلکہ لائنل اور جون بیری مور ہالی وڈ کے دو مانے ہوئے اداکار تھے۔ تھیٹر کی دنیا میں بیری مور کنبہ اس قدر مشہور ہوا کہ سترہ برس پہلے "شاہی خاندان" نامی ایک ڈراما جون اور ان کے عزیزوں کے بارے میں لکھا گیا تھا براڈوے کے سٹیج پر بے حد مقبول ہوا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بیری مور کنبے کا کوئی بچہ بھی ایکٹر نہ بننا چاہتا تھا' دو لڑکے آرٹسٹ بننے کے خواہاں تھے۔ لائنل کو اداکاری سے اس قدر نفرت تھی کہ جب اس کی دادی نے اسے اپنے ڈرامے "رقیب" کی کاسٹ سے خارج کر دیا تو وہ بے حد خوش ہوا۔ اب وہ اپنا پسندیدہ کام کر سکتا تھا۔ وہ آرٹسٹ بن کر تھیٹر کے مناظر کی تصویر کشی کر سکتا تھا۔

لائنل کچھ عرصے تک پیرس میں آرٹ کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس دوران میں جون بیری مور کو آرتھر بریسبین کے رسالے "جرنل" میں کارٹون بنانے' اور مختلف مضامین کی تصویر کشی کی ملازمت مل گئی۔ اس رسالے میں امریکی شاعرہ ایلا ویلر ولکاکس کی ایک نظم ہر ہفتے شائع ہوتی تھی اور جون بیری مور کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ ہر ہفتے اس نظم کے مرکزی خیال کو سامنے رکھتے ہوئے اسی صفحے پر ایک تصویر بنایا کرے۔ جون نے کبھی ان نظموں پر توجہ نہ دی تھی اور اپنی مرضی کے مطابق تصویریں بنا ڈالتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے مسز ولکاکس کی ایک رومانی اور محبت بھری نظم پر ایک ایسے شخص کی تصویر بنا ڈالی جو گردن میں رسے کا پھندہ ڈال کر درخت سے لٹکا ہوا تھا۔ مسز ولکاکس اپنی ادبی زندگی کے متعلق بڑی سنجیدہ تھی۔ یہ تصویر دیکھ کر اسے غصہ آگیا۔ اس نے ایڈیٹر کو لکھا کہ وہ اس آرٹسٹ سے ملنا چاہتی ہے جو اس کی نظموں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ جب نوجوان اور خوبصورت جون بیری اس کے گھر آیا تو ادھیڑ عمر شاعرہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے اسے چائے کی دعوت دی۔ بعد میں اس نے ایڈیٹر سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ بھی اس کی نظموں پر جون بیری مور ہی تصویریں بنایا کرے گا۔

تین ہفتوں بعد بریسبین نے جون کو لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کی بنا پر ملازمت سے جواب دے دیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں نے ایک دفعہ لائنل بیری مور سے پوچھا کہ آرٹسٹ بننے کے زمانے میں کیا کبھی ان پر ایسا بھی وقت گزرا تھا کہ انہیں تنگ دستی اور فاقوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

"کیوں نہیں۔ اس نے جواب دیا۔" کئی دفعہ جب رسالوں والے ہمارے خاکے اور تصویریں نہ خریدتے تو ہماری حالت اکثر پتلی ہو جاتی۔ لیکن ہم ہر دفعہ گھر تار بھیج کر پیسے منگوا لیتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات ہمارے پاس تار دینے کے لئے بھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ جون اور میا 14 سٹریٹ میں اپنے ویران سٹوڈیو میں سردیاں گزارا کرتے تھے۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ہمارے پاس فرنیچر خریدنے کے لئے کبھی پیسے نہ ہوئے۔ اصل میں ہمارے پاس بستر اور چارپائی بھی نہ تھی۔ ہم فرش پر سویا کرتے تھے ہمارے پاس اوڑھنے کے لئے کوئی کمبل نہ تھا۔ لہٰذا ہم اپنے اپنے اوور کوٹ میں ہوتے اور اس کے اندر اخبار وغیرہ رکھ لیا کرتے تھے۔ کئی دفعہ خود کو گرم کرنے کے لئے ہم اپنے اوپر کتابوں کے ڈھیر جما لیتے۔ ہمارے ساتھ فرینک ہٹلر نامی ایک نوجوان ادیب بھی رہا کرتا تھا۔ اس کا ایک دانت سونے کا تھا۔ جب ہماری حالت بے حد غیر ہو جاتی تو ہم اس کا دانت کسی کباڑیے کے پاس گروی رکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کے عوض ہمیں تین شلنگ سے زیادہ کبھی نہ ملے تھے۔

ایک دن جون بیری مور اور ہٹلر بھوکے تھے۔ انہوں نے دانت گروی رکھ دیا اور اس رقم سے چھوٹی موٹی تفریح کر لی۔ اب ان کے پاس فقط پانچ پنس رہ گئے تھے۔ وہ ایک سستے ہوٹل میں گئے جہاں پانچ پنس کے عوض دو گرم روٹیاں اور کافی کی دو پیالیاں ملتی تھیں۔ ہٹلر اندر گیا اور جون باہر بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ جب ہٹلر ایک روٹی اور ایک پیالی کافی ختم کر چکا اور اس نے دوسری روٹی اور کافی کی دوسری پیالی لانے کا آرڈر دیا تو جون اندر جا دھمکا اور اس نے ہٹلر کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ ہٹلر ایک دم اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور غمگین لہجے میں بولا "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آہ میری بیچاری ماں! پھر وہ ایک دم ہوٹل سے باہر نکل گیا اس طرح جون بیری کو ایک روٹی کھانے اور کافی کی دوسری پیالی پینے کا موقع مل گیا۔"

اگرچہ لائنل اور جون بیری ان دنوں فاقہ مست ہوتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ بڑی شخصیت بننے کے خواب دیکھا کرتے۔ لائنل آج بھی بڑے مزے سے ان دنوں کا ذکر کرتا ہے۔

لائنل بیری مور نے مجھے بتایا کہ اس کے والد کو جانور جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور وہ ریچھ بندر جنگلی بلیاں اور طرح طرح کے کتے گھر لایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ لائنل اور جون کو

ایک گاؤں میں سارا موسم گرما پینتیس کتوں اور ایک حبشی ملازم کے ساتھ گزارنا پڑا تھا۔

لائنل اور جون بیری مور کو ہمیشہ جانوروں سے محبت رہی۔ ایک دفعہ ایک بلی نے لائنل کے ہالی وڈ والے مکان کی ایک دیوار میں بچے دے دیئے بچوں کے لئے وہ جگہ کم تھی' لہٰذا اس نے اس کے آرام کے لئے دیوار کا ایک حصہ گرا دیا۔

جون بیری مور نے ایک پالتو بندر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے بچے کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتا اور اپنے ساتھ کھانے کی میز پر اسے کھانا کھلاتا۔ اس نے ایک دفعہ دو پرندے چار سو پونڈ میں خریدے تھے۔ اس نے اپنے پرندوں اور جانوروں کی دیکھ بھال کے لئے ایک خاص عمارت بنوا رکھی تھی اور اس کی تعمیر پر اس نے چار ہزار پونڈ خرچ کیے تھے۔ اس میں ہوا اور روشنی کا خاص انتظام تھا۔

ایک دفعہ اس نے ایک بڑا گدھ خریدا اور اس پر خاص توجہ دینے لگا۔ تمام دوسرے گدھوں کی طرح وہ بھی مردار کا بڑا شوقین تھا۔ جون بیری مور جو اس زمانے میں ایک ہزار پونڈ یومیہ تنخواہ لیتا تھا اور ہالی وڈ کا رومانی ایکٹر سمجھا جاتا تھا اکثر اس گدھ کے لئے مردار تلاش کرنے کی خاطر ہالی وڈ کی سڑکوں پر پڑے ہوئے گندگی کے ڈھیر اور ڈبوں میں جھانکتا رہتا۔ ایک رات بیری مور ایک مزدور جیسا لباس پہن کر گندگی کے ڈبوں میں جھانک رہا تھا۔ ایک متمول آدمی نے اسے دیکھ لیا اور سمجھا کہ کوئی بھوکا ہو گا۔ جو گرا پڑا کھانا حاصل کرنے کے لئے گندگی کے ڈبے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بیری مور کو بلا کر ایک شلنگ دیتے ہوئے کہا "اسے فقط کھانے پر خرچ کرنا۔" بیری مور نے اسے سلام کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "خدا آپ پر رحمت کرے۔"

جون بیری مور نے ہالی وڈ میں 600'000 پونڈ کمائے۔ ایک سال ایسا بھی تھا کہ اس نے ایک لاکھ پونڈ کمائے۔ اس نے پچاس ہزار پونڈ میں اپنے لئے ایک مکان خریدا اور اتنی ہی رقم سے سیر و تفریح کے لئے ایک چھوٹا سا سٹیمر بنوایا اس کے پاس وہ شمعدان بھی تھا۔ جو ایک زمانے میں آرچ ڈیوک فرانسس فرڈیننڈ کے محل کی زینت ہوا کرتا تھا۔ آرچ ڈیوک کے قتل ہی سے پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تھا۔ اگرچہ وہ شمع دان اس نے فقط پندرہ پونڈ میں خریدا تھا۔ لیکن جس کمرے میں اس نے اسے آویزاں کیا تھا۔ اس کی تعمیر پر اس نے چھ سو پونڈ صرف کیے تھے۔

1934ء میں اپنی صحت کی بحالی کے لئے وہ ہندوستان چلا گیا۔ اس برس اس نے پندرہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہزار پونڈ کمائے۔ مگر ساٹھ ہزار پونڈ خرچ کیے۔ اپنی آمدنی سے چار گنا زیادہ۔ اگلے برس حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ 1935ء کے پہلے چھ ماہ وہ 165 پونڈ روزانہ کے حساب سے خرچ کرتا رہا۔ حالانکہ ان دنوں اس کی یومیہ آمدنی فقط 60 پونڈ تھی۔ لیکن وہ اپنا زیادہ تر روپیہ دوسرے لوگوں پر خرچ کرتا تھا۔

اس کا قریبی دوست گن فاروئلر اس کے متعلق کہتا ہے "بیری مور نے کبھی اپنے لباس کی پروا نہ کی تھی۔ اس کے پاس گھڑی بھی نہ تھی اور نہ ہی کبھی اس نے انگشتری پہنی تھی۔ وہ دعوتیں عام دیتا اور کسی اعلیٰ ریسٹورانٹ کے قیمتی صوفوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے بجائے اپنے یا اپنے کسی دوست کے کچن میں بیٹھ کر کھانا کھانے کو ترجیح دیتا۔ وہ جیب میں کبھی زیادہ پیسے نہ رکھتا وہ اپنے بلوں کی ادائیگی پر بڑی توجہ دیتا۔ اس کے علاوہ اس نے کبھی روپے کو اہمیت نہ دی تھی۔"

جون بیری مور کے دوست ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اس کا ایک دوست انتہائی خستہ حال تھا اور دوسرا ونسٹن چرچل تھا۔ یہ فقط ونسٹن چرچل ہی کی حوصلہ افزائی تھی کہ جون بیری مور نے لندن میں اپنا کھیل "ہیملٹ" بند کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد بھی اسے جاری رکھا۔

بیری مور نے زندگی میں روایات کی کبھی پروا نہ کی تھی۔ ایک رات وہ ہیملٹ کے لباس میں سٹیج پر آیا اور موسیقی کی دھن پر لوگوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ ایک دوسری رات ایک دوسرے ڈرامے میں ایک رومانی کردار کرتے وقت اس نے پھولوں کے ایک گلدستے کو چوما اور پھر اسے اپنے دل سے لگا لیا دوسری بالکونی میں بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی ہنس پڑی۔ بیری مور آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے چلا کر کہا "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یہ رول مجھ سے زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہو تو یہاں چلی آؤ۔" یہ کہہ کر اس نے پھولوں کا گلدستہ تماشائیوں میں پھینک دیا جو ایک عورت کے منہ پر لگا۔ فوراً پردے گرا دیئے گئے۔ تماشائی غم و غصہ کے اظہار کے طور پر شور مچانے لگے۔ منیجر ڈر گیا کہ کہیں فساد نہ ہو جائے نصف گھنٹے تک ڈرامہ بند رہا اور جب کھیل شروع ہونے لگا تو منیجر نے ایکٹروں کو خبردار کر دیا کہ فساد ہونے کی صورت میں وہ اپنی حفاظت کے لئے جدھر سینگ سمائیں بھاگ جائیں جب جون سٹیج پر آیا تو مکمل خاموشی طاری ہو گئی اور اس نے اپنی شاندار اداکاری سے بپھرے ہوئے تماشائیوں کو رام کر لیا۔ اب وہی تماشائی تالیاں بجا بجا کر اسے داد دے رہے۔

تھے۔

ایک دوسرے موقع پر جب کہ فلو کی وبا عام پھیلی ہوئی تھی۔ تماشائیوں کے بار بار کھانسنے پر بیری مور کو غصہ آ گیا۔ وہ اپنے کوٹ کے نیچے ایک بڑی سی مچھلی چھپا کر سٹیج پر آیا اور اسے فٹ لائٹ کے قریب پھینک کر زور سے چلایا "گدھو! آج تمہارے ذوق کی تسکین اسی سے ہو سکتی ہے۔"

ہیملٹ کا کردار بہت سے اداکاروں نے انجام دیا ہے۔ لیکن جون بیری مور کی حیثیت بلاشبہ ان سب میں نمایاں ہے۔ اس نے ہیملٹ کا کردار سب سے زیادہ طویل عرصہ کیا ہے۔ اس کے بھائی لائنل نے اس کی قبر کے کتبے پر نہایت موزوں الفاظ کندہ کرائے ہیں "خدا حافظ! پیارے شہزادے۔" یہ لفظ ہوراتو نے اس وقت کہے تھے جب ہیملٹ اس کے بازوؤں میں دم توڑ رہا تھا۔ "خدا حافظ پیارے شہزادے! فرشتوں کے پروں کی آواز تمہیں سرمدی گیت سنائے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

آلیور وینڈل ہومز

وہ 93 برس کی عمر میں اپنے ذہن کی اصلاح کے لئے افلاطون کا مطالعہ کیا کرتا.....

میں آپ کو ایک ایسے شخص کے متعلق کچھ جتانے والا ہوں جس نے امریکہ کے طرز فکر پر خصوصاً قانونی سوچ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کا شمار امریکہ کے عظیم ترین مفکروں میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک عام انسان تھا اور سرکس اور تھیٹر وغیرہ بڑے شوق سے دیکھتا اور جاسوسی ناول اتنے رغبت سے پڑھتا کہ آخر اس نے خود کو اس بات پر مجبور کر لیا کہ وہ ہفتے میں دو سے زیادہ جاسوسی ناول ہرگز نہ پڑھے گا۔

اس شخص کا نام جسٹس آلیور وینڈل ہومز ہے۔ وہ اس وقت پیدا ہوا تھا' جب امریکہ ستائیس ریاستوں پر مشتمل تھا۔ وہ 94 برس کی عمر میں فوت ہوا ہے۔

آلیور وینڈل ہومز ان تمام بڑی شخصیتوں سے آشنا تھا جو گزشتہ ایک صدی میں پیدا ہوئی ہیں۔ جوانی کے دنوں میں وہ گھنٹوں رالف والڈو ایمرسن سے مختلف کتابوں پر اظہار خیال کرتا رہتا۔ اس کا والد ڈاکٹر آلیور وینڈل ہومز بذات خود ایک نامور ادیب تھا اور امریکہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

جب ہومز ایک لڑکا تھا تو اس کے والد نے اپنے بچوں سے کہہ رکھا تھا کہ کونے کے میز پر جو لڑکا سب سے زیادہ چابک دست اور بے ساختہ فقرہ کسے گا۔ اسے آملیٹ اور مربہ زیادہ مقدار میں ملے گا۔ چونکہ وینڈل کو آملیٹ اور مربہ بے حد پسند تھے۔ لہٰذا اس کی زبان بڑی جلدی تیز ہو گئی اس ابتدائی تربیت نے ساری زندگی اس کا ساتھ دیا۔ ستر برس بعد بھی وہ امریکہ کی سپریم کورٹ میں فقرہ بازی سے باز نہ آتا اور اس کے اکثر فقرے ریکارڈ میں سے خارج کرنے پڑتے۔

وہ اکثر کہا کرتا کہ ایک مفکر کو کلف لگے ہوئے کالر کی طرح اکڑا ہوا نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس میں ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے۔ ایک دن واشنگٹن میں جب کہ اس کے بال برف جیسے سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک سرکس دیکھنے گیا۔ جسٹس کے قہقہے دس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

قطاریں پیچھے سنائی دے رہے تھے اچانک وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک اجنبی شخص سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "میں اس بات پر ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے کم تر ذوق دیا ہے۔" (یاد رہے کہ یہ وہ جج تھا۔ جسے برطانیہ نے حال ہی میں ایک بڑا اعزاز بخشا تھا) میرے خیال میں امریکہ میں اس سے پیشتر کوئی ایسی شخصیت نہیں گزری۔ جس میں ایک مفکر اور عام آدمی دونوں کا امتزاج موجود ہو۔

جب اس نے 1857ء میں قانون پڑھنا شروع کیا۔ تو اس کا والد اس کے اس ارادے سے سخت پریشان ہوا۔ کیونکہ ان دنوں وکیلوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ "وینڈی! یہ خیال ترک کر دو۔" اس کے والد نے کہا۔ "قانون پڑھنے والا کوئی شخص کبھی عظیم نہیں ہوا۔"

لیکن وینڈل جانتا تھا کہ قانون پڑھنے سے بھی انسان اپنی زندگی عظیم بنا سکتا ہے۔ وہ قانون کی کتابیں اس انہماک اور شوق سے پڑھتا تھا کہ جیسے وہ ناول ہوں۔

1861ء میں وہ ہاورڈ یونیورسٹی سے لاء گریجویٹ ہونے والا تھا کہ خانہ جنگی پھوٹ پڑی۔ اس نے قانون کی کتابیں الماری میں بند کیں۔ اور سپاہی کی وردی پہن کر خانہ جنگی میں حصہ لینے چل پڑا۔ وہ تین دفعہ زخمی ہوا۔ ایک دفعہ گولی اس کے دل کے اتنی قریب لگی کہ جب سپاہی اسے سٹریچر پر ڈالے جا رہے تھے تو قریب سے گزرنے والے ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "اس آدمی پر اتنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو یہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔"

مر چکا تھا؟ ابھی تو اس کا قد بڑھنا بند نہ ہوا تھا۔ ابھی تو اس نے اپنے ملک کی نمایاں خدمات انجام دینا تھیں۔ 1864ء میں اسی نے ابراہام لنکن کی زندگی بچائی تھی۔

جب جنرل گرانٹ رچمونڈ میں مصروف پیکار تھا' تو باغیوں کا ایک دستہ اپنا رستہ بناتا ہوا الیگزینڈریا تک آ پہنچا۔ واشنگٹن سے فقط دس میل دور مرکزی فوجیں انہیں روکنے کے لئے فورٹ سٹیونز میں جمع ہو گئیں ابراہام لنکن جس نے پہلے کبھی لڑائی نہ دیکھی تھی۔ جلدی سے قلعے پر چڑھ گیا۔ وہ قلعے کی چھت پر کھڑا تھا کہ گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ اس کا لمبا تڑنگا جسم اور ریشمی ہیٹ جسے دور ہی سے دیکھ کر پتا چل جاتا تھا کہ وہ ابراہام لنکن ہے۔ دشمن کو صاف صاف دکھائی دے رہے تھے۔

جرنیلوں میں سے ایک نے اس کے قریب آ کر کہا۔ "مسٹر صدر! بہتر ہو گا کہ آپ نیچے اتر آئیں۔" لیکن لنکن نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس سے پانچ فٹ دور ایک سپاہی نے چھت کی دیوار سے ذرا اوپر سر اٹھایا کہ دشمن کی گولی نے اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ تین فٹ دور ایک

دوسرا آدمی گر پڑا۔

اچانک ابراہام لنکن کے عقب میں ایک گرج دار آواز سنائی دی "احمق نیچے اتر آؤ۔" لنکن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو کیپٹن ہومز کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ "بہت خوب کیپٹن!" لنکن نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں شہریوں کو مخاطب کرنے کا طریقہ آتا ہے۔" اور لنکن وہاں سے ہٹ گیا۔

جب یہ بات آہستہ آہستہ چاروں طرف پھیل گئی تو لوگ آلیور وینڈل ہومز کو ایک ہیرو تصور کرنے لگے، لیکن اس نے خود اس واقعے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ "مجھے ہیرو بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

جب خانہ جنگی کی آگ فرو ہو گئی۔ تو وینڈل ہومز یوں دوبارہ یونیورسٹی میں چلا آیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل بننے پر اس کی آمدنی زیادہ نہ ہو گی۔ ان دنوں وکیلوں کے متعلق یہ بات عام کہی جاتی تھی۔

"اگر ایک وکیل اپنی وکالت کے پہلے برس اپنا بورڈ وغیرہ لکھوانے میں کامیاب ہو جائے تو سمجھو کہ وکالت خوب چل رہی ہے۔"

آلیور وینڈل ہومز وکیل بننے کے بعد اتنے پیسے بھی نہ کماتا تھا۔ تیس برس کی عمر تک اس نے ایک پائی بھی نہ کمائی تھی۔ میں آپ سے حقیقت بیان کر رہا ہوں جب تیس برس کی عمر میں اس نے فینی ڈیکس ول سے شادی کی تو دونوں کے پاس ایک پھوٹی دمڑی بھی نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کے مکان کی تیسری منزل میں ایک کمرے میں رہا کرتا تھا۔ فینی ہومز پورا ایک سال محنت کرتی رہی تب کہیں وہ اس قابل ہوئے کہ اپنا الگ مکان لے سکیں۔ نئے مکان میں ان کے پاس بہت تھوڑا سامان تھا اور وہ فقط ایک سٹوو پر کھانا پکاتے تھے۔

اپنے فالتو وقت میں وینڈل ہومز نے ایک عظیم قانونی کلاسیک کتاب "امریکی قانون پر تبصرہ" کی از سرنو تدوین شروع کر دی۔ اس کتاب پر اسے بے حد محنت کرنی پڑی۔ وہ ہزاروں مقدموں کا مطالعہ کرتا اور ان کے متعلق مشہور ججوں کے فیصلے لکھتا۔ وقت گزرتا گیا۔ مگر اسے تاحال اپنے کام کی انتہا دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ متفکر ہونے لگا۔ اسے اس بات پر اعتقاد تھا کہ ایک شخص کو چالیس برس کی عمر میں اپنا مقام حاصل کر لینا چاہیے۔ اور وہ انتالیس برس کا ہو چکا تھا۔

فینی تمہارا کیا خیال ہے؟ "کیا میں چالیس برس کا ہونے تک دنیا میں اپنی جگہ پیدا کر سکوں گا؟" وہ اکثر نصف شب کو میز پر بکھری ہوئی کتابوں پر سے نظریں اٹھا کر اپنی بیوی سے

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

پوچھا کرتا" اور فینی کشیدہ کاری میں مصروف اسے جواب دیتی "کیوں نہیں وینڈل۔ مجھے یقین ہے تم ایسا کر کے رہو گے۔"

آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ وہی کتاب جسے اب امریکی قانون میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی چالیسویں سالگرہ سے فقط پانچ روز پہلے پریس سے چھپ کر نکلی۔

ہاورڈ یونیورسٹی اس کے کام سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے وینڈل ہومز کو نو سو پونڈ سالانہ تنخواہ پر پروفیسر کے عہدے کی پیش کش کی۔ اس پیش کش اور اعزاز سے اس کا سر چکرانے لگا۔ لیکن وہ طبعاً" چالاک واقع ہوا تھا۔ لہٰذا بھاگا بھاگا اپنے دوست جارج شائنک کے پاس مشورے کی غرض سے گیا۔

"موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔" شائنک نے مشورہ دیا "لیکن یہ شرط ضرور رکھنا کہ اگر تمہیں ماساچوسٹس ریاست کی ہائیکورٹ کا جج بننے کا موقع ملا تو تمہیں یونیورسٹی سے استعفیٰ دینے کا حق ہو گا۔" جج بننے کا موقع۔ اس خیال پر ہومز کو ہنسی آ گئی۔ لیکن اس نے شائنک کے مشورے پر عمل کیا۔

اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی دانائی یہی کی تھی۔ ابھی تین ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ ایک دن شائنک بھاگا بھاگا اس کے پاس یونیورسٹی میں آیا۔ اور ہومز کو کلاس روم سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ "بڑی عمدہ خبر لایا ہوں۔ اس نے پھولے ہوئے سانس سے کہا۔ "جسٹس آٹس لارڈ نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ماساچوسٹس کی سپریم کورٹ میں ایک جج کی جگہ خالی ہو گئی ہے۔ گورنر تمہیں جج بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے بارہ بجے سے پہلے تمہارا نام کونسل کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اب گیارہ بجے ہیں۔"

فقط ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ہومز نے اپنا ہیٹ پکڑا اور وہ دونوں گورنر ہاؤس کی سمت بھاگے۔ بازار میں لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ایک ہفتے بعد آلیور وینڈل ہومز ماساچوسٹس کی سپریم کورٹ کا جج بن چکا تھا وہ اکثر کہا کرتا کہ قسمت کی اس ایک ضرب نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔

ہومز کا دوسرے ججوں سے اکثر معاملات پر اختلاف رہتا تھا۔ مثلاً 1896ء میں عدالت میں ایک ایسا کیس آیا۔ جس میں کسی دکان کے سامنے مزدوروں کا مظاہرہ کرنا غیر قانونی کہا گیا تھا۔ ہومز جس نے اپنی ساری زندگی میں ایک دن بھی ہاتھ سے کام نہ لیا تھا۔ اس نے مزدوروں کا یہ حق جائز قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ سنانے کے بعد اس نے اپنے ایک دوست سے

کہا۔ "میں نے ملازمت میں اپنی مزید ترقی کے لئے راستہ خود ہی بند کر لیا ہے۔" یہ اس کا اپنا خیال تھا۔ لیکن وہ زندگی میں کبھی ذاتی مفاد کا شکار نہ ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ وہی کچھ کرتا جو اس کے نزدیک صحیح ہوتا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ یہ اور ایسے ہی کئی دوسرے فیصلے جو اس کے خیال میں اس کی ترقی کے راستے کی دیوار تھے وہی اس کی مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں روز ویلٹ، واشنگٹن میں ٹرسٹ کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا اور وہ ایسی تمام اجارہ داریاں ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ جب اس نے ہومز کے متعلق سنا تو کہنے لگا کہ "مجھے اس قسم کے جج کی ضرورت ہے۔"

جتنی جلدی ہو سکا، روز ویلٹ نے ہومز کو امریکہ کی سپریم کورٹ کا جج بنا دیا، ملک کے پاس اسے دینے کے لئے اس سے بڑا اور کوئی قانونی اعزاز نہ تھا۔ روز ویلٹ کو یقین تھا کہ ہومز اس کی مرضی کے مطابق عمل کرے گا لیکن وہ غلطی پر تھا۔ پہلے بڑے مقدمے ہی میں ہومز نے روز ویلٹ کے خلاف فیصلہ سنا دیا اور وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن اس کے برعکس لوگ بڑے خوش تھے۔ ہومز ان کی امیدوں کے مطابق نکلا تھا۔ ایک غیر جانب دار جج۔ اگلے تیس برس تک وینڈل ہومز دوسرے ججوں پر ہر اس بات پر اختلاف کرتا جو اس کے خیال کے مطابق صحیح نہ ہوتی، اس کی اختلاف پسندی امریکی سپریم کورٹ میں ایک روایت بن چکی ہے، اس لئے اسے "عظیم" اختلاف پسند بھی کہا جاتا ہے۔

واشنگٹن کی زندگی میں ہومز ایک رنگین شخصیت تھا۔ اسے پبلسٹی سے نفرت تھی، اور اسی لئے اس نے کبھی کسی کو انٹرویو نہ دیا تھا۔ لیکن اس کی نجی زندگی کے متعلق کوئی نہ کوئی بات مشہور ہو ہی جاتی۔ مثلاً وہ اور اس کی بیوی جانور پالنے کے بڑے شوقین تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ دو بندر اور تین فاختائیں ہر وقت ان کی خواب گاہ میں موجود رہتیں۔ بعض اوقات دن کے وقت ہومز عدالت میں اونگھنے لگتا۔ کیونکہ گزشتہ شب اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی۔ کوئی فاختہ بمبار طیارے کی طرح اس پر گر پڑتی۔ جس سے اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔

اسی برس کی عمر تک ہومز نے کبھی لفٹ استعمال نہ کی اور وہ اپنے مکان کا زینہ دو دو سیڑھیاں کر کے طے کرتا۔ جب کبھی کہیں آس پاس آگ لگنے کا الارم بجتا وہ اور اس کی بیوی ایک دم تیار ہو کر اس سمت بھاگ پڑتے۔ عدالت سے باہر اس کا انداز گفتگو بالکل عام لوگوں جیسا ہوتا۔ وہ اپنے سیکرٹریوں کو (جن میں فرانسس بڈل۔ سابق اٹارنی جنرل جیسے لوگ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

شامل تھے) ہمیشہ "نوجوان" احمق لڑکے کہا کرتا۔

1928ء میں ایک اخباری نامہ نگار نے ایک کاریگر سے پوچھا "کیا تمہارے نزدیک آلیور وینڈل ہومز کی کوئی اہمیت ہے؟"

"کیوں نہیں۔" کاریگر نے جواب دیا "وہ سپریم کورٹ کا سب سے جوان جج ہے جو بوڑھے ججوں سے ہمیشہ غیر متفق رہتا ہے۔" جب ہومز نے یہ بات سنی تو بہت ہنسا۔ اس وقت وہ ستاسی برس کا تھا۔ سپریم کورٹ کا سب سے معزز جج۔

ہومز ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ "میں اس وقت تک استعفیٰ نہ دوں گا جب تک خدا کی ذات مجھے اس فرض سے سبکدوش نہ کرے گی" اکانوے برس کی عمر میں اس کی صحت گرنے لگی۔ جب وہ بنچ سے اترتا تو دوسرے جج اسے سہارا دیتے ایک دن اس نے ایک کلرک سے کہا۔ "میں کل سے نہیں آؤں گا۔" اس کے بعد وہ کبھی عدالت میں نہ آیا۔

دو برس بعد جب اس کی 93 ویں سالگرہ تھی تو اس کی جگہ مقرر کیا گیا نیا جج فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ اسے سلام کرنے کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی مطالعہ گاہ میں بیٹھا افلاطون کا مطالعہ کر رہا ہے۔ روز ویلٹ نے پوچھا "جسٹس! اب کیوں افلاطون کا مطالعہ کر رہے ہو؟"

ہومز نے جواب دیا "اپنے دماغ کی اصلاح کے لئے۔"

ذرا خیال کریں 93 برس کی عمر اور ذہن کی اصلاح!

جب وہ فوت ہوا تو اس نے اپنا سارا روپیہ (50'000 پونڈ) حکومت کو دے دیا۔ اس نے اپنی ساری کتابیں بھی کانگرس کی لائبریری کو دے دیں تاکہ لوگ انہیں استعمال کر کے ان سے مستفید ہو سکیں۔

اس کے ملک نے اس جیسا اعلیٰ کردار انسان پیدا نہیں کیا اس کے فیصلے قانونی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جان کرسچن سمٹس

وہ برطانیہ کا بہت بڑا حلیف تھا۔ مگر اس نے ایک ایسی عورت سے شادی کی جس نے برطانوی جھنڈے کے نیچے بچوں کو جنم دینے سے انکار کر دیا۔

آپ کن پانچ لوگوں کو دوسری جنگ عظیم کے اہم ترین اتحادی راہنما گردانتے ہیں؟ میرے خیال میں ہم سب پہلے چار پر تو بلاشبہ متفق ہوں گے۔ چرچل، روز ویلٹ، سٹالن اور چیانگ کائی شیک۔ لیکن پانچواں درجہ آپ کسے دیں گے؟ اس پانچویں جگہ کے لئے میرا امیدوار متوفی جان کرسچن سمٹس فیلڈ مارشل ہے۔ جنوبی افریقہ کا وزیراعظم، جنوبی افریقہ جو امریکہ کے چھٹے حصے کے برابر ہے۔ جان کرسچن سمٹس ایک سیاست دان، ایک فلاسفر، ایک عالم، ایک سپاہی، اور ایک سائنس دان کی حیثیت سے مشہور ہے۔

اگر جان کرسچن سمٹس نے ایک تقریر نہ کی ہوتی تو میرے خیال میں دوسری جنگ عظیم میں جنوبی افریقہ غیر جانبدار رہتا۔

ہوا یوں کہ جب 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو جنوبی افریقہ کی پارلیمان نے غیر جانبداری کا فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس بلایا۔ جیمز ہرٹوز ان دنوں جنوبی افریقہ کا وزیراعظم تھا۔ وہ جرمنی کے خلاف انگلینڈ کا ساتھ ہرگز دینے کو تیار نہ تھا۔ یہی رائے اس کے حامیوں کی تھی۔ بہت سے لوگ تو کھلم کھلا ہٹلر کی کامیابی کے خواہاں تھے۔ آخر کیوں۔ بات یہ تھی کہ بہت سے بوائر ابھی تک آخری صدی کے اختتام پر لڑی جانے والی جنگ بوائر نہ بھولے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کو معاف نہ کیا تھا۔ اس جنگ میں برطانیہ نے ان ولندیزی نوآبادکاروں کے جانشینوں کو مغلوب کیا تھا۔ جو جارج واشنگٹن کی پیدائش سے اسی برس پہلے جنوبی افریقہ میں آباد ہوئے تھے۔ بہت سے بوائر برطانوی سلطنت سے قطع تعلق کر کے جنوبی افریقہ کو آزاد جمہوریہ بنانا چاہتے تھے۔ خفیہ طور پر پہلے ہی ووٹ ڈالے جا چکے تھے اور پارلیمان کے ارکان کی اکثریت جنگ میں غیر جانبدار رہنے کے حق میں تھی۔ آخر جان سمٹس

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

تقریر کے لئے اٹھا وہ بڑا نازک وقت تھا اور وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ جان سمٹس جانتا تھا کہ اگر جرمنی جنگ جیت گیا تو ہٹلر بندوق کے زور سے جنوبی افریقہ پر حکومت کرے گا۔ اس نے جنوبی افریقہ کی پارلیمان سے درخواست کی کہ وہ جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے۔ برطانیہ کی خاطر نہیں' بلکہ جنوبی افریقہ کی خاطر' اس نے پیٹرک ہنری جیسے آتشیں لہجے میں پرزور تقریر کی اور تیرہ ووٹوں سے جیت گیا۔ بعد میں وہ وزیراعظم بن گیا۔

جب ہٹلر کو معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ نے بھی اس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے تو اس نے قہقہہ لگایا اور یہ بات تھی بھی قہقہہ لگانے کے قابل اس وقت سارے جنوبی افریقہ کی سفید آبادی شکاگو سے بھی کم تھی اس کی کوئی بحری فوج نہ تھی۔ اس کے پاس ایک بھی جنگی جہاز نہ تھا۔ اس کی ہوائی فوج نہ ہونے کے برابر تھی۔ بری فوج چالیس ہزار غیر موزوں تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل تھی اس کے پاس دو ٹینک اور اتنی ہی زرہ بکتر کاریں تھیں۔ اس کے پاس ایک دن سے زیادہ جنگ کے لئے بارود نہ تھا۔ جنگی سامان بنانے کے لئے سارے جنوبی افریقہ میں فقط ایک فیکٹری تھی۔

جان سمٹس کو یاد تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جنوبی افریقہ کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور خانہ جنگی کی آگ بھڑکنے والی تھی۔ لہذا اس نے رضاکاروں کی بھرتی کے لئے اتنے خلوص سے تقریر کی کہ جنوبی افریقہ کے ہر سو باشندوں میں سے پندرہ فوج میں بھرتی ہو گئے۔

اگر امریکہ کی آبادی اسی تناسب سے فوج میں رضاکارانہ طور پر بھرتی ہو جاتی تو امریکہ کے پاس ایک کروڑ تیس لاکھ رضاکارانہ فوج ہوتی۔

جان سمٹس کو یاد تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں خانہ جنگی پھوٹ پڑنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جنوبی افریقہ کی فوج برطانوی فوج کے شانہ بہ شانہ لڑنے کو تیار نہ تھی لیکن اس دفعہ جان سمٹس نے فوج کو کچھ اس انداز سے ترتیب دی کہ اس میں پھوٹ نہ پڑ سکے۔ وہ تمام شہر جن کے پاس رائفلیں تھیں جان سمٹس نے انہیں حکم دے دیا کہ وہ انہیں حکومت کے پاس فروخت کر دیں۔ ورنہ وہ ضبط کر لی جائیں گی۔ لوگوں نے ستر ہزار رائفلیں فروخت کیں اور اس طرح اس نے مخالفت کو پرامن طور پر دبا دیا۔

جب ہٹلر نے پولینڈ پر قبضہ کیا تو اس وقت جنوبی افریقہ میں بارود بنانے کا فقط ایک کارخانہ تھا۔ وہاں مہینے میں دس لاکھ رائفل کی گولیاں بنتی تھیں۔ لیکن جنگ کے دوران میں

وہاں روزانہ دس لاکھ گولیاں بننے لگیں اس نے سوڈا واٹر کی ایک فیکٹری کو زرہ بکتر کاریں بنانے اور گھڑیاں بنانے والی ایک فیکٹری کو بم بنانے والے کارخانے میں منتقل کر دیا۔

موجودہ دور میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا ذخیرہ علم جان سمٹس کے برابر ہو، اس کے باوجود بارہ برس کی عمر تک وہ نہ تو پڑھ سکا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا۔ بچپن میں وہ بے حد کمزور تھا اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہتا اس کا اپنا والد اسے ذہانت سے کوسوں دور ایک بیمار لڑکا کہا کرتا تھا۔ یہ اس لڑکے کے والد کے الفاظ ہیں جس نے بڑا ہو کر دنیا کا ایک نامور عالم اور جنوبی افریقہ کی اہم ترین شخصیت بننا تھا۔

جب جان سمٹس جنوبی افریقہ کے وکٹوریہ کالج میں داخل ہوا تو اس نے ایک ہی کمرے میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا وہ تفریح اور گپ بازی میں اپنا وقت ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لالچ سے بچنے کے لئے وہ ایک کنبے کے ساتھ رہنے لگا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے اپنے کمرے کے مقابل والے ایک گھر کی لڑکی ہی سے شادی کی اور ان کے یہاں چھ بچے پیدا ہوئے۔

دو وجوہ کی بنا پر جان سمٹس نے کالج میں نمایاں حیثیت اختیار کر لی اول اس کے اندر علم حاصل کرنے کی ناقابل تسکین خواہش تھی۔ وہ ہر وقت پڑھتا رہتا۔ وہ نہ تو کوئی کھیل کھیلتا اور نہ ہی دوسرے لڑکوں کے ساتھ زیادہ اٹھتا بیٹھتا۔ فقط مطالعے میں مشغول رہتا۔ بارہ سے پندرہ گھنٹے تک روزانہ پڑھتا۔ ایک رات وہ ریاضی کا ایک سوال حل کرنے میں صبح تک جٹا رہا۔ جسے کلاس روم میں کوئی بھی حل نہ کر سکتا تھا۔

کالج میں بہ سرعت ترقی کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جان سمٹس کی یادداشت بہت تیز تھی۔ پڑھی ہوئی کوئی چیز اسے شاذ ہی بھولتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس سے اس کی یادداشت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کہا گیا؟ تو اس نے اپنی لائبریری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان دس ہزار کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھالیں۔ اس کا کوئی صفحہ کھول کر کوئی پیراگراف پڑھیں۔ میں آپ کو بتا دوں گا کہ اس سے اگلا پیراگراف کیا ہو گا۔ اور اس کا کیا مفہوم ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسے آزمایا۔ مگر جان سمٹس ہر امتحان میں پورا اترا۔

اگر اس کا علم مجھ اور آپ سے چالیس گنا زیادہ تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

کالج کے دنوں میں اس نے ایک یونانی گرامر چھ دنوں میں ازبر کر لی تھی آپ کو یہ معجزہ لگا ہو گا۔ واقعی یہ معجزہ ہے۔ لیکن اس نے یہ کر دکھایا۔ اپنی حیرت ناک یادداشت کے

بل بوتے پر اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں وظیفہ حاصل کیا۔ اور یہ بھی اس کی شاندار یادداشت ہی کا اعجاز تھا کہ اس نے قانون کا دو سال کا کورس ایک سال میں مکمل کر لیا۔ اور پھر کلاس میں اول آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کے لئے برا ریکارڈ نہیں جس کا والد اسے کند ذہن سمجھتا ہو۔

کیمبرج اس کا تعلیمی ریکارڈ اس قدر شاندار تھا کہ اسے کرائسٹ کالج میں پروفیسرشپ کی پیش کش کی گئی۔ اس کے علاوہ انگلینڈ میں اسے اور بھی بہت سے اچھے اچھے عہدے پیش کئے گئے۔ لیکن وہ ان سب کو ٹھکرا کر وکالت کی غرض سے جنوبی افریقہ چلا گیا۔

لیکن ایک وکیل کی حیثیت سے جان سمٹس کیپ ٹاؤن اور جوہنس برگ دونوں شہروں میں ناکام رہا۔ اسے لوگوں سے برتاؤ کرنا نہ آتا تھا۔ وہ بڑی سرد مہری اور تحکمانہ انداز میں ان سے پیش آیا اور ان سے بحث کرنے لگتا وہ اپنے مؤکلوں کو بھگا دیتا اور ججوں کے جذبات بری طرح مجروح کرتا۔

جب 1899ء میں بوائر جنگ چھڑی تو جان سمٹس نے یہ مظاہرہ بھی کر دیا کہ وہ ایک اچھا فوجی راہنما بھی ہے۔ چند ماہ کے اندر اندر یہ وکیل جس نے پہلے کبھی فوجی تربیت حاصل نہ کی تھی۔ جرنیل بن گیا۔ وہ بوائر کسانوں کے ایک گروہ کا سرغنہ تھا۔ اور جنوبی افریقہ کے ہزاروں میل کے اندر گوریلا جنگ لڑتا رہا۔ جب بوائروں کو رائفلوں' اسلحہ بارود اور گھوڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ برطانوی کیمپوں پر ہلہ بول دیتے۔ جان سمٹس کے گروہ میں شروع شروع میں فقط تین سو بوائر کسان تھے۔ لیکن جہاں کہیں بھی وہ گیا' رضاکار خود بخود اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو اس کے گروہ میں رضاکاروں کا دس گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

اس تحریک میں سمٹس نے سنسنی خیز کامیابی حاصل کی۔ اور وہ قومی ہیرو بن گیا وہ تھا بھی اس چیز کا مستحق کیونکہ اس زمانے میں جنوبی افریقہ میں بوائروں کی ساری آبادی مانچسٹر کی آبادی کے برابر تھی۔ اس کے باوجود جان سمٹس کی شاندار قیادت کے تحت بوائر بڑی جرات مندی سے انگریزوں سے لڑے۔ روئے زمین کی مضبوط ترین سلطنت سے پورے تین برس تک۔

گوریلا جنگ کے دوران میں دو کتابیں ہر وقت جان سمٹس کے پاس رہتی تھیں۔ ایک "نئی باتیں" اور دوسری کانٹ کی "مدلل دلائل" ذرا خیال کریں کہ ایک ایسا جرنیل

جس نے چند گھنٹے بعد ایک پل اڑانا ہو۔ کانٹ کے فلسفے پر غور کرنے میں مصروف ہو۔

جان سمٹس جنوبی افریقہ کا فقط وزیراعظم ہی نہ تھا بلکہ بذات خود ساری حکومت تھا۔ جنوبی افریقہ کی ہر شے اور ہر شخص اس کے قبضے میں تھا ہر شخص ماسوائے اس کی بیوی کے' وہ اور اس کی بیوی انگریزوں کے متعلق ہمیشہ غیر متفق رہتے تھے۔

جنگ بوائر کے اختتام پر انگریزوں نے بوائروں کو جو مالی امداد اور خودمختار حکومت دی تھی۔ جان سمٹس اس کے لئے ان کا بڑا شکرگزار تھا اس کے بعد جان سمٹس انگریزوں کا بڑا جوشیلا حامی بن گیا۔

لیکن اس کی بیوی ہمیشہ انگریزوں کے سخت خلاف رہی اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ اس کا کوئی بچہ برطانوی جھنڈے کے نیچے پیدا نہ ہو گا تمام جنوبی افریقہ پر برطانوی جھنڈا لہراتا تھا۔ مگر اس نے اپنے پلنگ کے سرہانے بوائر جمہوریہ کا جھنڈا لہرا رکھا تھا اور وہیں اس نے اپنے چھ بچوں کو جنم دیا۔

ایک دفعہ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرے شوہر نے مجھے تنبیہہ کی تھی کہ میں انگریزوں کی اس قدر مخالفت چھوڑ دوں۔ مبادا کہیں مجھے اس کی سزا نہ مل جائے اور ہمارے بچے انگریزوں سے شادی کر لیں۔ اب واقعی میری دو بچیوں نے انگریز نوجوانوں سے شادیاں کر لی ہیں۔"

عمر کے ساتھ ساتھ جان سمٹس کی سخت طبیعت میں نرمی آتی گئی۔ لیکن بعض اوقات کام کی بھرمار اور بوجھ کے نیچے وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ جب کبھی اس کی یہ حالت ہوتی تو اس کی بیوی بھی اس کے قریب نہ جاتی اور وہ اس کے سیکرٹری کے ذریعے اس کو پیغام بھجوا دیتی۔

اس کے اپنے بچے اس کے وسیع علم' اقتدار اور عزت کا بے حد خیال رکھتے اور اس کے سرد مہر اور تحکمانہ لہجے کی پرواہ نہ کرتے جنرل سمٹس نے ایک دفعہ کہا۔ "میرے اپنے بچے میرے ساتھ ایک باعزت اجنبی جیسا سلوک کرتے ہیں۔"

جان سمٹس نے جنوبی افریقہ کے وزیراعظم کے لئے مخصوص اور عظیم الشان بنگلے میں رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دارالحکومت سے دس میل دور اپنے فارم پر رہا کرتا۔ اس کی رہائش گاہ ایک اوسط درجے کا مکان تھی جسے اس نے چالیس برس پہلے تین سو پونڈ میں خریدا تھا اس میں لکڑی کا پرانا فرنیچر' تیر کمان' جانوروں کی کھالیں' کتابیں اور لوہے کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے عام دکھائی دیتے تھے۔

جان سمٹس برآمدے میں لوہے کی چارپائی پر سویا کرتا تھا۔ اس کے سرہانے ایک میز ہوتا جس پر چائے کی ایک پیالی اور ایک کتاب ہمیشہ پڑی رہتیں۔ فیلڈ مارشل جان کرسچن سمٹس وزیراعظم جنوبی افریقہ اپنا بستر ہمیشہ خود بچھایا کرتا۔ اور ایسا کرنے میں وہ کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا۔

مکان کی طرح گرد و نواح کے مناظر میں بھی بڑی بے ترتیبی پائی جاتی تھی۔ نہ تو کہیں پھول دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی لان وغیرہ کی حفاظت کی جاتی تھی۔

اس کے پوتے ایک درخت کے ساتھ آویزاں موٹر کار کے ایک ٹائر سے سارا دن لٹکتے رہتے۔ اور یہی ان کی بہت محبوب ترین تفریح تھی۔

جنوبی افریقہ کے وزیراعظم کی ہابی بیالوجی اور باٹنی تھیں۔ اس نے ایک ایسی گھاس تلاش کرنے کے لئے جو جنوبی افریقہ کے خشک میدانوں میں پیدا ہو سکے' اپنے ایک کھیت میں پچاس مختلف قسم کی گھاسیں اگائیں۔ وہ چھ ہزار ایکڑ اراضی کا مالک تھا۔ اس نے اپنی زمین میں لاکھوں درخت اگا رکھے تھے۔ جنہیں ایک دن کاٹ کر کوئلہ بنایا جانا تھا۔

جان سمٹس نے اس معاہدہ امن پر دستخط کیے تھے جس کی رو سے پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے جس قدر اس نے جدوجہد کی ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے شخص نے کی ہو گی۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

برنارڈ بارچ

ایک نجومی نے اس کی والدہ کو مشورہ دیا' مگر اب وہ امریکہ کے صدروں کو مشورہ دیتا ہے۔

گزشتہ صدی کے اختتام کا ذکر ہے کہ نیویارک کے سٹی کالج کے ایک میدان میں لڑکوں کا ایک گروپ بیس بال کھیل رہا تھا۔ اچانک ان میں زبردست لڑائی ہو پڑی۔ ان میں سے ایک لڑکے نے بیس بال کا بلا ایک دوسرے لڑکے کے سر پر دے مارا۔ جس لڑکے کے سر پر بلا لگا وہ برنارڈ بارچ تھا۔ بلا لگتے ہی وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا' جب اسے ہوش آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے بائیں کان کا پردہ پھٹ چکا ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کان سے بہرہ ہو چکا ہے۔

اس بہرے کان نے برنارڈ بارچ کی ساری زندگی بدل دی۔ اس نے ویسٹ پوائنٹ میں بھرتی ہونے اور باقاعدہ فوج میں افسر بننے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں امتحان بھی پاس کر چکا تھا۔ لیکن بہرہ ہو جانے کے باعث اسے ویسٹ پوائنٹ میں نہ لیا گیا۔ بہرے کان نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ فوج میں جانے کا خیال ترک کر کے کوئی کاروبار کرنے لگے۔ بعد میں اس نے کاروبار میں بے حد دولت کمائی اور اپنے لئے کاروباری حلقے میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ صدر ووڈرو ولسن اس کی تجارتی ذہانت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسے ایک اتنی بڑی تجارتی ذمہ داری سونپ دی جو اس سے پہلے امریکی تاریخ میں کسی شخص کو نہ سونپی گئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ کی ساری صنعت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں کسی صنعت کو چلانے یا بند کرنے کا پورا اختیار اسے حاصل تھا۔ کوئی بھی تاجر یا کارخانہ دار اس کی رضامندی کے بغیر تانبے' لوہے' پٹسن یا کسی دوسری دھات یا چیز کا ایک پونڈ تک بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔

جب ووڈرو ولسن 1919ء میں معاہدہ امن پر دستخط کرنے کے لئے یورپ گیا تو وہ برنارڈ

بارچ کو اقتصادی مشیر کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے گیا۔

برنارڈ بارچ نے مابعد جنگ کے ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلے کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ یعنی امریکی قوم کو کسی قسم کی بے روزگاری اور مالی بحران کا شکار کئے بغیر اسے جنگی صنعت سے نکال کر دوبارہ زمانہ امن کی صنعت میں داخل کرنے کا مسئلہ۔

برنارڈ بارچ کی زندگی پر بیس بال کے بلے کی ایک چوٹ ہی اثر انداز نہیں ہوئی بلکہ ایک نجومی کے پاس اس کا ایک دفعہ جانا بھی اس کی زندگی کو بدلنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی والدہ اسے ایک دفعہ ایک ایسے نجومی کے پاس لے گئی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کے سر کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں کیا کام کرے گا۔ اس نے برنارڈ کے سر کی نبض دیکھ کر بتایا کہ اسے تاجر بننا چاہئے۔ لیکن برنارڈ بارچ اپنے والد کی طرح ایک سرجن بننا چاہتا تھا۔ اپنے والد کی طرح اس کے اندر بھی طب کا ولولہ موجود تھا اور وہ ایک برس تک علم طب کا مطالعہ بھی کرتا رہا تھا۔ لیکن اس کی والدہ اسے کہا کرتی کہ نجومی کے مشورے کے مطابق اسے کاروبار کے متعلق علم حاصل کرنا چاہئے اپنی والدہ کو خوش کرنے کی غرض سے وہ شیشے کا سامان بنانے والی ایک فیکٹری میں پندرہ شلنگ ہفتہ وار تنخواہ پر ملازم ہو گیا اور رات کے وقت قانون پڑھنے لگا۔ اس پر اس کی والدہ کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ وکیل نہ بن جائے۔ نجومی کی نصیحت کو ذہن پر رکھتے ہوئے وہ اکثر اپنے بیٹے سے کہتی رہتی۔ ایسا کام کرو جس میں ڈھیروں روپیہ ہو' آخر ایک دن اس نے والدہ کا کہا مان لیا۔

وہ وال سٹریٹ (امریکہ کا سٹہ بازار) گیا۔ اور وہاں سٹہ کھیلا سٹہ کھیلنے والوں کی ننانوے فیصد تعداد تباہ ہو گئی لیکن برنارڈ بارچ نے لاکھوں پونڈ کمائے یہ ایک حیرت ناک ریکارڈ ہے۔ وال سٹریٹ میں برنارڈ بارچ کی حیرت ناک کامیابی کا کیا راز تھا؟ اس سلسلے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں اول اس نے تھوڑے عرصہ میں بڑے بڑے تاجروں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ وہ اس کی دلکش شخصیت' ایمان داری' سدا بہار مسکراہٹ اور چابکدستی سے بڑے متاثر ہوتے تھے۔ بڑے بڑے تاجر اسے اپنے ساتھ کھلاتے اور اسے کاروبار کے گر بتاتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ ترقی کرنے لگا۔ ابھی وہ ستائیس برس کا تھا کہ ٹامس فارچون ریان نے لیگٹ اینڈ میئر تمباکو خریدنے کے لئے برنارڈ بارچ کو 26'000 پونڈ دیئے۔

وال سٹریٹ میں برنارڈ بارچ کا دوسرا اہم راز یہ تھا کہ وہ ہمیشہ حقائق کی تلاش میں رہتا

تھا۔ بارچ ہر کام سوچ سمجھے منصوبے کے تحت کرتا اور اس کے بارے میں ضروری حقائق پہلے ہی سے معلوم کر لیتا کسی کام کا مکمل جائزہ لئے بغیر وہ اسے ہرگز ہاتھ نہ ڈالتا۔

کسی کاروبار کے متعلق حقائق کا جائزہ لے کر اس کے بارے میں پیش گوئی کرتا جس سے برنارڈ بارچ کو کاروباری حلقے میں ایک معتبر مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اسی قابلیت نے اسے امریکہ کے پانچ صدروں کا معتبر مشیر بنایا تھا۔ ولسن۔ ہارڈنگ' کالج' ہوور اور روز ویلٹ۔ ووڈرو ولسن اسے ڈاکٹر "حقائق" کے لقب سے یاد کرتا تھا۔

برنارڈ بارچ نے ایک دفعہ وال سٹریٹ میں اتفاقیہ طور پر بے حد روپیہ کمایا۔ واقعہ یوں ہے۔ کئی ماہ کی تحقیق کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تانبے کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کی قیمت گر جائے گی اور تانبے پر آٹھ فیصد نفع کم ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے تانبے کے ہزاروں حصے فروخت کر دیئے۔ نفع کم ہو گیا اور گھنٹے کے اندر اندر سٹاک دس درجے کم ہو گیا۔ برنارڈ بارچ کے شریک کار فوری نفع کمانا چاہتے تھے۔ لیکن اس دن ان کی رسائی ان تک نہ ہو سکی۔

وہ ایک مذہبی چھٹی کا دن تھا۔ برنارڈ نے اپنی والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مقدس دن گھر پر گذارے گا۔ اور اس روز کاروبار سے قطع تعلق کر لے گا۔ اگر وہ تانبے کا بیچا ہوا سٹاک پھر سے خرید لیتا تو اسے 8000 پونڈ نفع ہو جاتا تھا۔ لیکن کل تک انتظار کرنے میں حالات نہ جانے کیا ہو جاتے۔ وہ اس کے گھر بار بار ٹیلی فون کرتے۔ اس کے گھر تار بھیجے گئے مگر کوئی جواب نہ آیا۔ آخر انہوں نے خاص قاصد دوڑائے لیکن سب بے سود۔ بارچ تک کسی کی رسائی نہ ہو سکی۔ بعد میں اس نے تسلیم کیا کہ اگر اس روز وہ اپنے دفتر میں ہوتا تو تانبے کا سارا سٹاک خرید کر فوری طور پر آٹھ ہزار پونڈ کما لیتا۔ دوسرے دن صورت حالات پر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ تانبے کے سٹاک کے بغیر ہی رہنا بہتر ہو گا۔ ایک سال کے اندر اندر تانبے کا سٹاک ایک سو درجے گر گیا اور برنارڈ بارچ کے لئے وہی سودا نفع بخش بن گیا۔

اسے روپیہ کمانے اور روپیہ تقسیم کرنے دونوں باتوں سے محبت تھی چند برس ہوئے اس نے امریکہ کی فوج کو بازوو بنانے کے لئے مشینری خریدنے کی خاطر چھ لاکھ پونڈ دیئے وہ دوسری جنگ عظیم کے آثار بھانپ گیا تھا اور امریکی فوج کی لاپرواہی نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔

گزشتہ جنگ کے دوران میں اس نے اپنی جیب سے ستر ہزار پونڈ دیئے اور ماہرین کے ایک گروہ کو کچھ ایسے حقائق جن کی امریکی حکومت کو ضرورت تھی معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ یہ خرچ حکومت کو ادا کرنا چاہیئے تھے کیونکہ یہ جنگی صنعت کے بارے میں خرچ ہونا تھا لیکن برنارڈ بارچ وہ خرچ خود برداشت کرنے پر مصر رہا۔

1918ء میں جب واشنگٹن میں فلو کی خطرناک وبا پھیلی تو برنارڈ بارچ نے غریبوں کو اس وبا سے بچانے کے لئے اپنی جیب سے ہسپتال بنوا دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر جب امریکہ میں جنگی سامان بننا بند ہو گیا تو اس سے ہزاروں مزدور بے روزگار ہو گئے۔ برنارڈ بارچ نے ان لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچانے کے لئے اپنی جیب سے دس ہزار پونڈ بطور کرایہ دیا۔

بچپن کے ایک ہتک آمیز تجربے کی بنا پر برنارڈ بارچ برسوں شرمیلے پن اور احساس کمتری کا شکار رہا۔ وہ واقعہ اسے آج بھی یاد ہے وہ بڑا تلخ اور بے رحم تجربہ تھا اس تجربے سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بچوں کا مذاق اڑانے کا کیا حال ہوتا ہے۔ واقعہ یوں ہے ایک عورت میں وہ اور چند دوسرے لڑکے بالغوں کے سامنے ازبر کی ہوئی نظمیں سنا رہے تھے' جب برنارڈ بارچ کی باری آئی تو وہ گانے کے انداز میں نظم سنانے لگا۔

سامنے والی قطار میں بیٹھا ہوا ایک شخص برنارڈ بارچ کی نقلیں اتار کر اس کا مذاق اڑانے لگا۔ اسے اس قدر صدمہ پہنچا' اس کے جذبات اس قدر مجروح ہوئے اور اس نے اپنی ہتک محسوس کی کہ وہ آنسو بھری آنکھوں سے وہاں سے گھر بھاگ آیا۔

اس تجربے نے اس کے اندر شرمیلے پن کا ایک ایسا احساس جگا دیا۔ جس نے ایک عمر تک اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آج پھر برنارڈ بارچ کسی خاص یا عام اجتماع میں لکھی ہوئی تقریر پڑھتا ہے۔

آخر بارچ نے دریافت کیا کہ شرمیلا پن دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ جس کام سے وہ ڈرتا ہے' اس کو کرے' جب وہ سولہ برس کا تھا تو ایک رات اسے ایک دعوت میں جانا پڑا تھا۔ لہٰذا اس کی ماں نے سیفٹی پن وغیرہ لگا کر اسے برنارڈ کے پہننے کے قابل بنا دیا۔ لیکن جب وہ دعوت والے گھر پہنچا تو اپنے شرمیلے پن کے سبب اس سے زینہ نہ چڑھا گیا اور وہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں

ایک آدمی کسی کام سے نیچے آیا اور اس نے برنارڈ کو کمرے میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ وہ شخص ترغیب دے کر اسے اپنے ساتھ اوپر لے گیا جونہی اس نے برنارڈ کا تعارف ایک لڑکی سے کرایا اور وہ دونوں رقص کرنے لگے۔ اس کا شرمیلا پن دور ہو گیا۔

برنارڈ بارچ کو اپنے والد سے ایک نصیحت ورثے میں ملی تھی۔ یہ نعمت اس کی زندگی میں چراغ راہ رہی ہے اس کے والد نے وہ نصیحت اپنی ایک تصویر کے نیچے لکھ کر دی تھی۔ وہ تصویر برنارڈ بارچ کے کمرے میں اس طرح آویزاں ہے کہ آتے جاتے کی اس پر نظر پڑتی رہے۔ وہ نصیحت یہ ہے۔

"ہمیشہ ایک غیر متزلزل استقلال کو اپنا راہنما بناؤ۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل اومر بریڈلے

اس کے شرمیلے پن نے اسے امریکہ کا ایک عظیم جرنیل بنا دیا۔

ایک دن ایک لڑکا سینٹ لوئس کے نزدیک دریائے میسی سیپی کے کنارے امتحان دے رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ سو میل کا سفر کر کے امتحان دینے آیا تھا اور اب اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ امتحان میں فیل نہ ہو جائے۔ اس کے حوصلے بے حد پست ہو چکے تھے۔ وہ ویسٹ پوائنٹ میں اس لئے داخل نہ ہونا چاہتا تھا کہ اسے فوجی مستقبل سے دلچسپی تھی بلکہ فقط اس لئے کہ وہاں وہ مفت تعلیم حاصل کر سکتا تھا' جہاں تک کالج کی تعلیم کا تعلق ہے وہ فقط مفت ہی پڑھ سکتا تھا' کیونکہ مفلسی کے سبب اس میں تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہ تھی اس کا والد فوت ہو چکا تھا اس کی والدہ ایک درزی کے پاس کام کرتی تھی اور فقط اتنے پیسے کماتی تھی کہ گھر کا نمک مرچ بمشکل چلتا۔

وہ تمام پرچے بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتا رہا۔ لیکن جب جیومیٹری کا پرچہ آیا۔ تو اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ اس نے ایک مدت سے جیومیٹری کی کتاب کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ اس نے سوال حل کرنے کے لئے بڑا مغز مارا۔ اس کی کوئی پیش نہ چلی آخر اس نے لکھنا بند کر دیا۔ بے کار لکھنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ فیل ہو چکا ہے۔

اس نے پرچہ اٹھایا اور اسے ممتحن کے حوالے کر کے کمرہ امتحان سے باہر چلنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ممتحن اخبار کے مطالعے میں مصروف ہے وہ لڑکا اس قدر شرمیلا تھا کہ اسے ممتحن کے مطالعے میں دخل انداز ہونے کی ہمت نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ جب تک ممتحن اخبار بینی سے فارغ نہیں ہوتا۔ وہ کیوں نہ ایک دفعہ پھر جیومیٹری کا سوال حل کرنے کی کوشش کرے۔ آخر بے کار بیٹھنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔ تب ایک معجزہ ہوا۔ ایک زمانے میں جیومیٹری کے متعلق پڑھے ہوئے قاعدے اس کے ذہن کی اتھاہ گہرائیوں سے خود بخود منکشف ہونے لگے اور اس نے جیومیٹری کے تمام سوال حل کر لئے۔ امتحان پاس کر کے وہ ویسٹ پوائنٹ میں داخل ہو گیا۔ بعد میں وہی لڑکا ویسٹ پوائنٹ میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ریاضی کا پروفیسر اور امریکہ کا ایک بہترین فوجی کمانڈر بنا- اس کا نام بریڈلے ہے- جنرل اومر نیلسن بریڈلے، دوسری جنگ عظیم میں فوجوں کی نقل و حرکت کی بہت بڑی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی اس نے اتنی برق رفتاری سے فتوحات حاصل کیں کہ دیکھنے اور سننے والے حیران رہ گئے-

ممکن ہے اومر بریڈلے 1911ء میں جیومیٹری میں اپنی کم لیاقت کے سبب ناکام رہ جاتا لیکن اس نے 1915ء میں ویسٹ پوائنٹ سے گریجوایٹ کی سند حاصل کی- اور 164 لڑکوں میں اوپر سے اس کی 44 ویں حیثیت تھی- آئزن ہاور بھی شروع سے اومر بریڈلے کے ساتھ رہا تھا- آئزن ہاور نے 61 ویں حیثیت حاصل کی تھی اومر بریڈلے سے سترہ درجے نیچے- جب طرز سلوک کا امتحان لیا گیا تو شرمیلا اومر بریڈلے چھٹی پوزیشن پر تھا- اور زندہ دل اور باتونی آئزن ہاور 125 پوزیشن پر-

1915ء میں ویسٹ پوائنٹ سے گریجوایٹ ہونے والی یہ کلاس اس لئے بھی مشہور ہے کہ اس نے تیس سے اوپر جرنیل پیدا کئے پانچ طلبا میں سے ایک ضرور بعد میں جرنیل ہوا- اومر بریڈلے اپنی کلاس میں سے پہلا لڑکا تھا جو جرنیل بنا- فقط بیس بال کی ٹیم نے آٹھ جرنیل پیدا کئے- جنرل اومر بریڈلے بھی بیس بال کی ٹیم کا ایک اچھا کھلاڑی تھا- بیس بال کے علاوہ وہ فٹ بال بھی کھیلا کرتا تھا-

وہ اب بھی سپورٹس میں دلچسپی لیتا تھا- اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ وہ ہر قسم کے کھیل خصوصاً گالف میں بڑی مہارت رکھتا ہے- اسے مچھلیاں پکڑنے اور شکار کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے اس نے شکاری کتوں کا ایک جوڑا بھی پال رکھا ہے-

سپورٹس میں دلچسپی کے سبب اس کی صحت بہت اچھی ہے- 1942ء میں جب کہ وہ 49 برس کا تھا تو اس نے 28 ویں پیدل فوج کی قیادت کی تھی- اتنی عمر کے باوجود وہ رسوں کے ساتھ یوں لٹک جاتا اور اس کی ہوشیاری سے ندیاں اور دریا عبور کرتا کہ نوجوان حیران رہ جاتے لیکن اسے کبھی تھکاوٹ کا احساس نہ ہوا تھا-

جب جنرل بریڈلے کی لڑکی کالج میں داخل ہوگی تو اس نے اسے سپورٹس میں نمایاں امتیاز حاصل کرنے کی نصیحت کی- وہ جانتا تھا کہ کھیلوں میں حصہ لینے سے اس کی صحت اچھی رہے گی اور اچھی صحت خوشی کا مخزن ہوتی ہے- اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ جنرل بریڈلے عام و خاص کا امتیاز ہرگز نہیں رکھتا اور اس نے اپنی بچی کو بھی یہی تعلیم دی ہے- جب وہ

جارجیا میں انفنٹری سکول میں استاد تھا۔ تو اکثر دوسرے سپاہیوں کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو کر کھانا کھا لیا کرتا اور شکار پر جاتے وقت کسی عام سپاہی کو اپنے ساتھی کے طور پر ساتھ لے جایا کرتا۔

اخبار "نیوز ویک" نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ جنرل بریڈلے ایک عام آدمی ہے۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے اس نے جواب میں کہا "سولہ آنے صحیح ہے۔" اس نے کبھی بننے یا خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے وردی پر جرنیلوں والے سارے تمغے کبھی نہیں لگائے۔ جنگ کے دوران میں وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "میں جنگ کرنے جا رہا ہوں۔" پریڈ کرنے نہیں۔

وہ بڑا منکسر مزاج اور کھرا انسان ہے۔ 1934ء میں اسے لیفٹیننٹ جنرل کی عارضی ترقی دی گئی۔ اخباروں میں یہ خبر عام ہوئی۔ یہ کوئی راز نہ تھا' ہر کوئی اسے جانتا تھا لیکن جنرل بریڈلے نے اپنے شانے پر تیسرا ستارہ اس وقت تک نہ لگایا' جب تک اسے ترقی کے سرکاری احکام حاصل نہ ہوئے۔

جنرل بریڈلے بڑے دھیمے مزاج کا انسان ہے اور اکثر نرم لہجے میں گفتگو کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا کہ اس نے کبھی کوئی ایسا بڑا آدمی نہیں دیکھا جو طیش میں آ کر بلند آواز میں نہ بولنے لگے۔ ایک دفعہ سسلی میں اسے بھی اپنی آواز بلند کرنی پڑی تھی۔ لیکن اس کی آواز میں کرختگی اور غصہ نہ آیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ وہ ایک ایسے جرمنی آفیسر سے انٹرویو کر رہا تھا۔ جسے تھوڑی دیر پہلے پکڑا گیا تھا۔ اتفاقیہ طور پر حفاظتی دستے سے ایک گولی چل گئی۔ جو بریڈلے کے کان کے بالکل قریب سے گذری۔ اس نے پلٹ کر اس سپاہی کی طرف دیکھا اور بلند آواز میں بولا۔ "براہ مہربانی اس چڑیل چیز سے محتاط رہیں۔"

جب بریڈلے نے امریکہ کی ملٹری اکیڈمی سے سند حاصل کی تو اس کے استاد نے ویسٹ پوائنٹ کی سالانہ کتاب میں اس کے بارے میں یہ الفاظ لکھے۔ "اس کا یہاں آنا ہی ایک معجزے سے کم نہیں..... اس نے جس رفتار سے یہاں کام شروع کیا ہے اگر وہ اسے برقرار رکھ سکا تو ہم میں سے بعض ایک دن اپنے پوتوں اور نواسوں سے کہا کریں گے۔ "جنرل بریڈلے میرا ہم جماعت ہوا کرتا تھا۔"

یہ پیش گوئی 1943ء کے موسم بہار میں بالکل سچی ثابت ہوئی جبکہ بریڈلے نے طونس میں دوسری جنگ عظیم کی ایک نمایاں فتح حاصل کی ایک ایسی فتح جس میں اس نے جرمنوں کو

kutubistan.blogspot.com

بزرتی کے مقام پر گھیرا ڈال کر بے بس کر دیا اور اس نے 37000 جرمن سپاہی قید کیے۔ فقط 421 جانیں تلف ہوئیں اس نے پچاس ہزار سپاہی، کئی ہزار گاڑیاں اور بہت سا سامان رسد رات کی تاریکی میں دو ہزار میل سے لا کر ایسی جگہ پر حملہ کیا جہاں جرمنوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ان پر حملہ ہو سکتا ہے۔ جنرل بریڈلے نے ایسے نئے اور غیر روایتی طریقے استعمال کیے جو ملٹری کے کسی نصاب میں درج نہ تھے۔ وہ طریقے جنہوں نے جرمنوں کے حواس گم کر دیئے۔

چند دن بعد طونس میں ساری جرمن فوج کا شیرازہ بکھر گیا۔ سینتیس (37) ہزار جرمن سپاہی قید کیے گئے۔ ذرا غور کریں۔ ایک اتحادی سپاہی کی موت کے مقابلے میں اٹھاسی جرمن سپاہی کیا تناسب ہے! جنرل بریڈلے نے حیران کن رفتار سے طونس میں فتح حاصل کی۔ فوجی تاریخ میں اتنے کم جانی نقصان سے بہت کم اہم فتوحات حاصل کی گئی ہیں۔

یہ فتح تیس سال کے مسلسل مطالعے اور تیاری کا نتیجہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امن کے قیام میں زیادہ فوجی افسر تساہل پسند ہو گئے اور اپنا وقت بیکار مشغلوں میں گزارنے لگے۔ لیکن اومر بریڈلے ان میں سے نہ تھا۔ ویسٹ پوائنٹ سے نکلنے کے بعد بریڈلے نے اپنا وقت فوجی سائنس پڑھانے اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ اس نے ایک دفعہ کہا تھا "میں نے فوج میں ہر قسم کا کام کیا ہے۔" یہ بالکل درست ہے اپنی انتالیس سالہ فوجی ملازمت میں اس نے تینتیس مختلف فوجی عہدوں پر کام کیا ہے۔

1920ء سے 1924ء تک وہ ویسٹ پوائنٹ میں ریاضی پڑھاتا رہا۔ اس تجربے نے اسے دوسری جنگ عظیم میں میدان کار زار میں جلد فیصلہ کرنا سکھایا۔ جلد فیصلے جنہوں نے جرمنوں کو تباہ کیا اور امریکیوں کو بچا لیا۔

جنرل بریڈلے تمباکو نوشی کا عادی نہیں۔ شراب بھی کبھی کبھی خاص مواقع پر پیتا ہے۔ اسے کھانے سے بڑی رغبت ہے آئس کریم تو اس کی پسندیدہ چیز ہے۔ آئس کریم کے پچاس کپ کھانے سے بھی اس کی طبیعت نہیں بھرتی۔

اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ جنرل بریڈلے مہماتی کتابوں اور جاسوسی کہانیوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن اس کا زیادہ تر مطالعہ فوجی معاملات کے متعلق ہوتا ہے۔ وہ سول خانہ جنگی پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لی کو اپنی قوم کا دوسرا عظیم ترین جرنیل تصور کرتا ہے۔ پہلا کون ہے؟ اس کے خیال میں یہ اعزاز بھی جنرل جارج لی مارشل،

امریکی فوج کے چیف آف سٹاف کو جانا چاہیئے۔

میں نے مسز بریڈلے سے پوچھا کہ ان کی اٹھائیس سالہ ازدواجی زندگی میں اس کے شوہر نے سب سے بڑی غلطی کون سی کی ہے۔ اس نے جواب دیا "سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی بڑی غلطی نہیں کی۔" بہت سی بیویاں یہی جواب دیتی ہیں، آپ کا کیا خیال ہے۔

پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے شوہر میں سب سے بری خامی کون سی ہے۔ "بعض اوقات وہ مجھے قنوطی نظر آتے ہیں۔" اس نے جواب دیا لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ ہر مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں۔ "اگر کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ایک خامی ہے تو میری دعا ہے کہ یہ خامی ہم سب کو نصیب ہو جائے۔"

1944ء میں جنرل بریڈلے نے ایک اخباری نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے پیش گوئی کی تھی "اگر کسی روز مجھے فقط تین گھنٹوں کے لئے ہوائی پرواز کا اچھا موسم مل جائے تو میں آپ لوگوں کو نارمنڈی سے جرمنوں کو بھگا کر دکھا دوں۔ اس کے پاس ہر ضروری چیز موجود تھی۔ لیکن موسم کی خرابی اسے حملہ کرنے سے روکے رہی۔ آخر 25- جولائی کو جنرل بریڈلے کو حسب منشا موسم مل گیا تب جرمنوں پر آسمان سے آگ برسنے لگی۔ امریکی بمبار طیاروں نے جرمنوں کی صفیں چیر دیں۔ افراتفری کے عالم میں جرمنوں کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ مخالف سمت کو بھاگنے لگے۔

اومر بریڈلے جو ایک زمانے میں اس قدر شرمیلا تھا کہ کمرہ امتحان میں اپنے ممتحن کی اخبار بینی میں حائل ہونے اور اسے یہ بتانے کہ وہ جیومیٹری کا پرچہ چھوڑ کر جا رہا ہے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ بعد میں امریکہ کا ایک کامیاب ترین فوجی جرنیل بنا۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز

اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے ایک دفعہ واشنگٹن سے کیلی فورنیا تک فرضی نام کے تحت سفر کیا اور ضروری کاغذات اپنی بیوی کے کشیدہ کاری کے تھیلے میں چھپائے رکھے۔

ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز دنیا کے ایک عظیم ترین بحری جنگی بیڑے کا کمانڈر انچیف رہ چکا ہے۔ بحرالکاہل کے علاقے کا کمانڈر ان چیف بھی وہی تھا جزیروں اور نمکین پانی پر مشتمل یہ علاقہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بائیس گنا بڑا ہے۔ شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، یورپ، ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے عین وسط میں تاریخ کی ایک عظیم جنگ جیتی۔ لیکن جب اس نے 1941ء کے اختتام پر بحرالکاہل کے جنگی بیڑے کی قیادت سنبھالی تو صورت حال تو بے حد خراب تھی۔

7- دسمبر 1941ء کی صبح کے آٹھ بجے امریکہ کا بحرالکاہل کا جنگی بیڑا آٹھ جنگی جہازوں پر مشتمل تھا۔ دو گھنٹے بعد آٹھ میں سے پانچ جہاز پرل ہاربر میں غرق ہو چکے تھے۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے بمباری سے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا ان میں ایڈمرل نمٹز کا نمائندہ جہاز "آری زونا" بھی تھا۔ باقی کے تین جہازوں کو اس بری طرح نقصان پہنچا کہ مرمت کے لئے انہیں واپس بھیجنا پڑا یہ شکست سے بھی بڑھ کر کوئی چیز تھی۔ یہ ایک بہت بڑی تباہی تھی امریکی اور جاپانی دونوں اس حقیقت سے واقف تھے۔

جاپانی یہ بھی جانتے تھے کہ امریکی بحری فوج کے پاس جہازوں، جنگی طیاروں، مشین گنوں، آب دوز کشتیوں بارود اور دوسری متعلقہ اشیاء کی بھی کمی ہے اگر جاپانیوں کو معلوم ہو جاتا کہ پرل ہاربر کی تباہی کے بعد امریکہ کے پاس سارے بحرالکاہل کی حفاظت کے لئے فقط 176 ہوائی جہاز تھے تو انہیں سخت حیرت ہوتی۔ امریکی بحری فوج جانتی تھی کہ جاپانی دوسرا حملہ جلد ہی کرنے والے ہیں۔

ان حالات میں صدر روز ویلٹ جانتا تھا کہ جاپانیوں کے ساتھ جنگ جیتنے کا زیادہ تر

انحصار اس بات پر ہے کہ پرل ہاربر میں صحیح قسم کا آدمی بھیجا جائے اور وہ صحیح آدمی ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز تھا۔

جس انداز میں ایڈمرل نمٹز نے واشنگٹن سے پرل ہاربر تک سفر کیا' وہ کسی جاسوسی کہانی یا مہماتی ناول کا ایک باب محسوس ہوتا ہے اس کے پاس حکومت کے ضروری خفیہ کاغذات تھے۔ خفیہ کاغذات جن میں درج تھا کہ جاپانیوں نے امریکی نیول کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ جاپان کے ایجنٹ وہ خفیہ کاغذ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اسی کے لئے اگر انہیں ایڈمرل نمٹز کو قتل کرنے کی ضرورت پڑی تو یہ بھی کر گزریں گے لہٰذا اپنی شناخت کو چھپانے کے لئے ایڈمرل نمٹز نے واشنگٹن سے کیلی فورنیا تک ایک فرضی نام "مسٹر وین رائٹ" کے تحت سفر کیا۔ اس نے اپنی نیوی وردی کے بجائے عام شہریوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک افسانوی جاسوس کی طرح اس نے خفیہ کاغذات اپنے بریف کیس کی بجائے اپنی بیوی کے کشیدہ کاری کے تھیلے میں ڈال رکھے تھے۔

آخر صدر روز ویلٹ نے دوسرے اعلیٰ بحری افسروں کی موجودگی میں پرل ہاربر کی شکست کے بعد بحرالکاہل کے جنگی بیڑے کی قیادت کے لئے ایڈمرل نمٹز ہی کو کیوں چنا تھا؟ ابھی تو اٹھائیس افسروں کی ترقی کے بعد اس کی ترقی ہونی تھی۔ اسے ان اٹھائیس افسروں پر ترجیح دے کر فقط بحرالکاہل کے جنگی بیڑے ہی کا نہیں بلکہ سارے علاقے کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا۔ اتنا بڑا اختیار اور اتنی بڑی ذمہ داری اسے فقط اس لئے سونپی گئی تھی کہ اس کے اندر چار نمایاں خوبیاں تھیں۔

پہلی نیوی کے معاملات کا اسے دیرینہ تجربہ تھا۔ ایناپوس کی نیوی اکیڈمی سے نکلنے کے چار برس بعد اس نے کسی جنگی جہاز پر ملازمت کرنے کے لئے درخواست دی۔ اس کے نزدیک یہ بڑی دلکش ملازمت تھی لیکن اس کی امید کے خلاف اسے دوسری جگہ ملازمت دی گئی۔ اسے نو ساختہ بے ڈھنگی آبدوز کشتیوں میں سے ہر ایک پر ملازم رکھ لیا گیا۔ اس سب میرین میں اسے تیل کے جلنے کی بڑی عجیب بدبو آتی تھی جیسے ویل مچھلی میں سے تیل نکالنے والا کوئی کارخانہ ہو۔ وہ یوں چلتی تھی۔ جیسے ویل مچھلی زخمی ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔

لیکن اس بدبو اور خطرے کے باوجود چیسٹر ڈبلیو نمٹز نے اپنی آبدوز جنگی کشتی سے محبت کی۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ سب میرین کو بحری جنگوں میں بے حد اہمیت حاصل ہو گی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لہٰذا اس نے ان آبدوز جنگی جہازوں کے ساتھ جذباتی طور پر گہرا رشتہ جوڑ لیا۔ 1913ء میں جب وہ فقط ستائیس برس کا تھا۔ وہ بحیرہ اٹلانٹک میں امریکی سب میرین فورس کا کمانڈر بن چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں وہ آبدوز فوجوں کے ساتھ کام کرتا رہا۔ بعد میں اس نے پرل ہاربر میں سب میرین ہیڈ کوارٹر تعمیر کیا اور اس کا انچارج بھی وہی تھا۔

اس کے بعد وہ نیوی کی تمام سرگرمیوں کے متعلق علم اور تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے نکل پڑا۔ اس نے یورپ میں ڈیزل انجن کا مطالعہ کیا اور پہلے امریکی جہاز میں اس نے انجن لگایا۔ چیف انجینئر کا کام بھی وہی کیا کرتا تھا۔

اس نے سب میرین سے جنگی جہاز تک نیوی کے ہر شعبے میں کام کیا ہے جہاں کہیں بھی وہ گیا۔ اس کی قابلیت اور وسیع علم کی بنا پر لوگوں نے اس کی عزت کی ایک دفعہ وہ ایک پرانے جنگی جہاز کا کمانڈر تھا کہ اچانک ایک دن اس میں سوراخ پیدا ہو گیا اور جہاز میں پانی بھرنے لگا۔ جہاز میں سے پانی نکالنے والے پمپ کی رفتار سست تھی۔ جس کے سبب جہاز میں پانی لحہ بہ لحہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ جہاز کا چیف انجینئر گھبراہٹ میں اس کے پاس آیا "جہاز ڈوب جائے گا۔ اب کیا کیا جائے۔"

ایڈمرل نمٹز نے جواب دیا "بارٹن کی انجینئرنگ کی کتاب" کا صفحہ نمبر 84 دیکھیں۔ آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ایسی صورت حال کیا کرنا چاہیے۔"

چیف انجینئر نے اس کے مطابق عمل کیا اور جہاز ڈوبنے سے بچ گیا۔

نیوی میں ایڈمرل نمٹز کی کامیابی کی وجہ دوسری یہ ہے کہ وہ سمندر کی سطح پر تیرنے والی ہر چیز سے محبت کرتا ہے۔ ایڈمرل نے ایک دفعہ کہا تھا "مجھے جو کام دیا گیا۔ میں نے اسے خلوص نیت' اور دلی محبت سے کیا ہے۔ میں نے اس میں پوری پوری دلچسپی لینے کی کوشش کی ہے۔"

ایڈمرل نمٹز میں تیسری نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر آدمیوں کی قیادت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تحسین کے معاملے میں وہ بڑا فراخ دل واقع ہوا ہے اور اپنے آدمیوں پر اکثر اس کے ڈونگرے برساتا رہتا ہے۔ نیوی میں اس سے زیادہ کسی دوسرے شخص کی عزت نہیں ہوتی۔

فاسٹر بیلے نے بحرالکاہل پر تقریباً دو برس بسر کیے تھے۔ اسے نیوی کے ہزاروں افسروں اور سپاہیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ "نیویارک ٹائمز" میں ایک مضمون لکھتے ہوئے اس نے کہا

تھا کہ ان دو برس میں اس نے کسی کی زبان سے ایڈمرل نمٹز پر نکتہ چینی نہ سنی تھی۔ فاسٹر ہیلیے نے یہ بھی لکھا ہے نمٹز کے ساتھ رہنے والے افسر اور سپاہیوں نے کبھی گھٹن محسوس نہ کی تھی۔ اس نے کبھی فوجی سخت گیری کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ وہ اپنا ہر کام نرمی سے نکالنے کا قائل ہے۔"

ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز میں چوتھی خوبی یہ ہے کہ بحران اور مصیبت کے وقت اس نے کبھی خود اعتمادی اور تحمل کا دامن نہیں چھوڑا۔ پرل ہاربر میں اس نے جس خوش اسلوبی سے معاملات کو نبھایا وہ اس حقیقت کی زندہ مثال ہے۔

جب وہ پرل ہاربر پہنچا تو متفکر اور گھبرائے ہوئے نیوی آفیسر اس کے پاس بھاگے آئے۔ لیکن اس سے ملاقات کے بعد ہر ایک کے چہرے پر خود اعتمادی اور سکون کے آثار نمایاں تھے۔ جب اخباری نمائندوں نے اسے آئندہ منصوبوں کی وضاحت پر مجبور کیا تو اس نے فقط اتنا کہا۔ "وقت خود ہی بتا دے گا۔"

اور واقعی اس نے بتا دیا۔ ذرا جاپانیوں سے پوچھ کر دیکھیں۔

فطرت نے ایڈمرل نمٹز کو حسن ظرافت بطور عطیہ بخش رکھی ہے اس کی اس خوبی نے اسے ہر ایک میں مقبول کر رکھا ہے۔ وہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ انگریزی میں جنگی جہاز کو مؤنث کے صیغے سے کیوں پکارا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "اسے بنانے' سنوارنے پر بہت سا روپیہ صرف ہوتا ہے۔"

جب وہ ایڈمرل بنا تو اس کی بیوی نے اس سے درخواست کی کہ اب وہ مضحکہ خیز قسم کی باتیں کہنی بند کر دے کچھ عرصے تک اس نے بیوی کا کہا مان لیا۔ آخر ایک دن اسے واشنگٹن میں نرسوں کی ایک جماعت کو ریڈ کراس کے سلسلے میں مخاطب کرنا تھا۔ اس دن بڑی گرمی تھی۔ نرسیں ابھی ابھی ایک طویل اور خشک تقریر سن چکی تھیں۔ لیکن جب سفید بالوں والے ٹلکٹر نمٹز نے انہیں سمندر کے متعلق ایک دلچسپ کہانی سنائی تو وہ حیران رہ گئیں۔ لڑکیوں نے دوسری کہانی کے لئے شور مچانا شروع کر دیا۔ لہٰذا اس نے ایک اور کہانی سنا دی۔ اس کی بیوی بھی کچھ فاصلے پر بیٹھی سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایڈمرل موڈ میں آ گیا۔ تو عجب عجب گل کھلائے گا۔ لہٰذا وہ چوکنی ہو گئی۔ اس نے لڑکیوں کو چپ کرانے کی بڑی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ آخر ایڈمرل نمٹز دوسری کہانی سنا کر بیٹھ گیا۔ وہ تقریر کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ علم اور تحقیق پر مبنی تقریر نہ تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ سامعین میں بہت

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مقبول ہوئی اور کسی نے کرسی میں پہلو بدلنے کی کوشش نہ کی۔

خواہ حالات کیسے بھی ہوں۔ ایڈمرل نمٹز پر جاپانی بحری بیڑے کو شکست دینے اور تباہ کرنے کے بعد وہ مشورے کے لئے ویسٹ کوسٹ میں ایڈمرل ارنسٹ جے کنگ کے پاس گیا۔ جب اس کا جہاز کنارے کے ساتھ لگنے والا تھا تو اچانک ایک مہلک حادثہ رونما ہو گیا۔ ایک بہتا ہوا شہتیر جہاز کے پیندے میں اس طرح لگا کہ جہاز الٹ گیا۔ جہاز کا پائلٹ مر گیا دو افسر بری طرح زخمی ہوئے۔ ایڈمرل نمٹز کو بھی چوٹیں لگیں۔ جب جہاز کے دوسرے لوگوں کو نکال کر ساحل کی طرف لایا جا رہا تھا تو ایڈمرل نمٹز ایک کشتی میں کھڑا تھا۔ اس کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ کشتی کے ملاح کو بالکل معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ لہٰذا وہ چلا کر بولا "ارے بھئی! بیٹھ جاؤ نا۔" ایڈمرل نمٹز نے بڑی فرماں برداری سے اس کی بات مان لی۔ لیکن جب ملاح نے غور سے دیکھا تو اس کے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے رہ گئی اس کی زبان میں لکنت آ گئی اور وہ معافی طلب کرنے لگا۔ ایڈمرل نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے لفظوں پر قائم رہو۔ تم نے بالکل صحیح کہا تھا۔ گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز ناشتہ کرنے سے پہلے ایک گھنٹہ روزانہ سیر کرتا ہے ہفتے میں ایک لمبی پیراکی کرتا ہے اور ہر روز مشق کی خاطر ایک درجن گولیاں چلاتا ہے۔

اس میں مکمل طور پر ستانے اور تازہ دم رہنے کی بڑی صلاحیت ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی بھاری ذمہ داریاں اٹھائے ہوئے ہیں۔ دوپہر کو وہ دھوپ میں ضرور لیٹتا ہے۔ اکثر اسی حالت میں وہ کانفرنس وغیرہ منعقد کرتا ہے۔

پرل ہاربر کی تباہی کے بعد دو برس ایڈمرل نمٹز بڑی جرات سے حفاظتی جنگ لڑتا رہا۔ لیکن پھر اس نے اتنی چابک دستی اور برق رفتاری سے جاپانی بحری بیڑے پر حملہ کیا کہ جاپانی حیران رہ گئے اس حملے نے جاپانی بحری بیڑہ تباہ کر کے رکھ دیا۔

آنا پوس کی یونیورسٹی میں جہاں سے ایڈمرل نمٹز نے سند حاصل کی تھی وہاں سالانہ کتاب میں اس کے بارے میں یہ الفاظ درج ہیں۔

"گزشتہ اور آئندہ کل کا ایک پراعتماد انسان۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مادام چیانگ کائی شیک

اس نے اپنے شوہر کو بچانے کے لئے لاکھوں دشمن سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہی۔

1876ء کا ذکر ہے کہ بوسٹن میں ایک چینی لڑکا اپنے چچا کی دوکان سے چوری چھپے بھاگ گیا۔ لڑکے کو کاروبار سے نفرت تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا چچا تعلیم جیسی فضول چیز کے سخت مخالف تھا۔ اسی سبب اس کا بارہ سالہ بھتیجا دکان سے بھاگ کر بوسٹن کی بندرگاہ پر پہنچا اور ایک ایسے دخانی جہاز میں چوری چھپے چڑھنے پر کامیاب ہو گیا۔ جو بندرگاہ سے چلنے ہی والا تھا۔

بعد میں تقدیر نے اسی چینی لڑکے کو مادام چیانگ کائی شیک کا والد بنانا تھا مادام چیانگ کائی شیک جو آج کے دور کی ایک اہم شخصیت ہے اس چینی لڑکے نے چینی تاریخ کے ایک غیر معمولی خاندان کی بنیاد رکھی۔۔۔۔ سوونگ خاندان' اس کی تین لڑکیوں کے متعلق 340 صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی گئی ہے انہوں نے گمنامی کے گوشے سے نکل کر چین کے تین بڑے راہنماؤں سے شادیاں کیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اور ان کے شوہروں نے جدید چین کو جنم دیا ہے۔

اس کی ایک بیٹی' چونگ لنگ نے ڈاکٹر سن یات سن سے شادی کی۔ ڈاکٹر سن یات سن جسے چین کا جارج واشنگٹن کہا جاتا ہے' چینی انقلاب کا خالق یہ وہ شخص ہے۔ جس نے مانچو خاندان کی 276 سالہ حکومت کا تختہ الٹ کر جمہوریہ چین قائم کیا۔

دوسری لڑکی ای لنگ نے ڈاکٹر کنگ سے شادی کی۔ ڈاکٹر کنگ جو بعد میں چین کا وزیر مال بنا اور جو چینی تاریخ کے عظیم ترین شخص کنفوس کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی تیسری لڑکی "مے لنگیا" جس کا مطلب ہے "خوبصورت زندگی" نے چیانگ کائی شیک سے شادی کی۔

جب وہ لڑکا جسے تقدیر نے مادام چیانگ کائی شیک کا باپ بنانا تھا جہاز میں بیٹھا تو اسے

معلوم نہ تھا کہ جہاز کس طرف جا رہا ہے اسے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ تو فقط اپنے چچا سے دور ہونا چاہتا تھا۔ جہاز کے کپتان کا نام چارلی جونز تھا اور وہ ایک کٹر عیسائی تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے جہاز میں ایک غیر مذہبی چینی لڑکا بھی ہے تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے لڑکے کو اپنے کیبن میں چھوٹے موٹے کام کے لئے رکھ لیا۔ کپتان چارلی جونز نے اس لڑکے کو عیسائی بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لہٰذا وہ ہر رات لڑکے کو اپنے پاس بٹھا کر اسے بلند آواز میں بائبل سناتا اور ساتھ ساتھ مطلب بھی سمجھاتا جاتا۔ آخر جب جہاز نارتھ کیرولینا میں ولنگٹن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو کپتان چارلی جونز نے وہ چینی لڑکا پادری ریکارڈ کے حوالے کر دیا جو ففتھ سٹریٹ مینھوڈسٹ چرچ کا انچارج تھا۔

کلیسا میں لڑکے کو سب سے پہلے عیسائی بنایا گیا اس کا نام سوونگ تھا لیکن وہ اس بات پر مصر رہا کہ اس کا عیسائی نام چارلی جونز سوونگ رکھا جائے یہ نام اس نے اس اچھے کپتان کی یاد میں رکھا تھا جو اسے بڑی شفقت سے ایک نئی دنیا میں لایا تھا۔

پادری ریکارڈ نے لڑکے میں بڑی دلچسپی لی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے خدا نے خود وہ لڑکا اس کے پاس بھیجا ہے۔ تاکہ اسے عیسائی بنا کر عیسائیت کی تبلیغ کے لئے اسے چین بھیجا جائے۔ لہٰذا وہ پادری ایک امیر آدمی کے پاس گیا اور اسے لڑکے کی تعلیم کے اخراجات اٹھانے کے لئے کہا۔ جس میں وہ بخوشی رضامند ہو گیا۔

چارلی جونز سوونگ جانتا تھا کہ اس کا مہربان لکھ پتی ہے۔ لیکن اس نے سوچا کہ اسے خود بھی تھوڑی بہت محنت کر کے اپنی تعلیم کے تھوڑے بہت اخراجات برداشت کرنے چاہئیں۔ لہٰذا وہ گھر گھر پھر کر کتابیں فروخت کرنے لگا۔

کئی برس بعد چین میں واپس آ کر اس نے شنگھائی میں جدید مشینری کا تعارف کرایا۔ اس نے وہاں بائبل بھی شائع کی اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر ڈاکٹر سن یات سن کے لئے انقلابی کتابچے شائع کرتا رہا۔

جب چارلس جونز سوونگ نے اپنی تینوں لڑکیوں کو تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا تو اس نے ایک ایسی روایت کی خلاف ورزی کی تھی جو ہزاروں برس سے چلی آ رہی تھی۔ جب تعلیم سے فراغت حاصل کر کے وہ واپس چین آئیں تو ان کے اندر امریکی خیالات و جذبات پوری طرح سرایت کر چکے تھے اور وہ سینٹ پال کے بعد عیسائیت کی سب سے بڑی علم بردار تھیں۔

مادام چیانگ کائی شیک نے جارجیا کے شہر مالکون کے ویسلیے یان کالج برائے خواتین میں تعلیم حاصل کی۔ یہ دنیا میں لڑکیوں کا قدیم ترین کالج ہے۔ بعد میں اس نے ماچا ساٹس کے ویلیلے کالج سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔

انیس برس کی عمر میں امریکہ چھوڑنے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ اب تو فقط میرا چہرہ مشرقی رہ گیا ہے۔ "جب وہ شنگھائی پہنچی تو اسے چینی زبان سیکھنی پڑی۔"

لیکن اہم بات یہ ہے کہ مادام چیانگ کائی شیک ایک نئے ولولے اور اعتقاد کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی مفلوک الحال اور بیمار چینیوں کی حالت سدھارنے کے لئے وقف کر دے گی۔ اس نے مزدور بچوں کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان چینی بچوں کے حقوق کی خاطر لڑی۔ جو دو پونڈ سالانہ تنخواہ پر کارخانوں میں کام کرتے تھے ذرا غور کریں دو پونڈ ہفتہ یا ماہوار نہیں' بلکہ سالانہ تنخواہ۔

مادام چیانگ کائی شیک نے سارے چین کا دورہ کیا۔ وہ جہاں بھی جاتی۔ عورتوں کی تنظیموں سے افیون' غلاظت اور بیماریوں کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے کہتی۔ اس نے صفائی اور صحت کے لئے خواتین میں ایک نیا جذبہ بھر دیا۔ وہ بڑی حیرت مگر خلوص سے اس کی باتیں سنتیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے کمربستہ ہو جاتیں۔

اس نے صفائی' تعلیم' تعاون اور اچھے حالات میں زندگی بسر کرنے کی تبلیغ کی۔ اس مقصد کے لئے وہ چین کے دور افتادہ دیہات میں جاتی۔ بعض اوقات تھکاوٹ کے مارے وہ ہوائی جہاز کے فرش پر لیٹ جاتی مگر اپنا ارادہ ہرگز ملتوی نہ کرتی۔

اگرچہ چیانگ کائی شیک لاکھوں آدمیوں پر حکومت کرتا تھا۔ مگر اسے اپنی بیوی "مے لنگ" سے شادی کرنے کی خاطر مسلسل پانچ برس کشمکش کے عالم میں رہنا پڑا۔ مے لنگ نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنی والدہ کی مرضی کے بغیر اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ اور اس کی والدہ جنرل چیانگ کائی شیک سے بات کرنے کو تیار نہ تھی۔ آخر اس کی والدہ سے گفتگو کرنے کے لئے اسے جاپان جانا پڑا۔ جہاں وہ تفریح کے لئے گئی ہوئی تھی۔ آخر جب جنرل نے یہ ثابت کر دیا کہ اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور جب اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ہر روز بلا ناغہ بائبل پڑھا کرے گا اور عیسائی بن جائے گا تو پھر کہیں اسے شادی کے معاملے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ 1926ء میں چیانگ کائی شیک اور مستقبل کی مادام چیانگ کائی شیک کی شادی ہوئی۔

مادام چیانگ کائی شیک ہر صبح جنرل کو سیر کے لئے لے جاتی' اسے بائبل کی تمثیلیں سناتی اور مسیحی دین کی وضاحت کرتی۔ شادی کے دو برس بعد چیانگ کائی شیک عیسائی ہو گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ مادام چیانگ کائی شیک نے ہزاروں غیر ملکی سپاہیوں کی جان بچائی ہے اس کے شوہر کی قیادت کے تحت چینی عوام کا صدیوں سے بکھرا ہوا شیرازہ یکجا ہوا اور وہ ڈٹ کر جاپانیوں سے لڑے۔ اگر پہلے جیسی صورت حال رہتی' تو جاپانی فوجوں کو بحرالکاہل پر قبضہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔

جب چین بری طرح داخلی انتشار کا شکار تھا اس زمانے میں مادام چیانگ کے اثر و رسوخ کا اندازہ ایک ڈرامائی واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے حاسد اور خود غرض جرنیلوں کے ایک گروہ نے جو جنرل چیانگ کائی شیک سے نجات حاصل کر کے خود چین پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ اسے اغواء کر لیا۔

"اسے دو ہفتوں تک قید رکھا گیا۔ مگر اس نے ان کے مطالبات تسلیم کرنے سے سراسر انکار کر دیا۔ اس دوران میں اسے جو کھانا دیا گیا اس نے ہرگز نہ کھایا۔ وہ ان جرنیلوں کو لعنت ملامت کرتا اور بار بار یہی کہتا کہ وہ ان سے ہرگز مفاہمت نہ کرے گا۔ اور اپنے ملک کو دغا دینے کی نسبت موت کو ترجیح دے گا۔ وہ بغاوت جس میں جنرل چیانگ کائی شیک کو گرفتار کیا گیا تھا 12_ دسمبر 1936ء کو پھوٹی تھی۔ جنرل چیانگ کائی شیک اپنے شب خوابی کے لباس میں بھاگ کر قریبی پہاڑوں کے ایک سلسلے میں جا چھپا۔ وہ ایک بلند دیوار پر چڑھ رہا تھا کہ نیچے ایک کھائی میں گر پڑا۔ اس کی پشت پر اتنی سخت چوٹیں آئیں کہ وہ بمشکل چل پھر سکتا تھا۔

گولیاں اس کے سر پر سے گنگناتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ گولیاں' مشین گنیں اور بم آسمان سے برس رہے تھے۔ گرنے کے بعد وہ دوبارہ بھاگ رہا تھا کہ پھر سے خاردار جھاڑیوں والی ایک کھڈ میں گر پڑا۔ جب باغی سپاہیوں نے اسے حراست میں لیا تو اس نے انہیں حکم دیا کہ یا تو اسے وہیں ہلاک کر دیں یا پھر اس کی حیثیت کے مطابق اس سے سلوک کریں۔

اس کے اغوا کی خبر چین پر ایک بم کی طرح گری۔ سکول کے طلبا رونے لگے۔ اور بہت سے سپاہیوں نے خودکشی کر لی۔ اس کی اپنی فوج اس شہر پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ جہاں اسے محبوس کیا گیا تھا۔

چین ایک دوسری خانہ جنگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ فقط ایک عورت نے یہ آگ بھڑکنے

سے روک لی۔ فقط ایک عورت، مادام چیانگ کائی شیک اس نے چیانگ کائی شیک کے۔۔۔۔ حامی جرنیلوں کو حملے کا حکم دینے سے روک دیا۔ یہ بات تاریخ میں ایک موڑ ثابت ہوئی۔

چیانگ کائی شیک نے اپنی بیوی کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس کے پاس نہ آئے اسے بار بار تنبیہہ کی گئی کہ اگر وہ آئی تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ لیکن وہ ایک جہاز کے ذریعے اس تک پہنچی۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر باغی سپاہی اسے پکڑنے کی کوشش کریں تو ایک دم ریوالور سے اسے ہلاک کر دے۔

اس نے ایک کمزور خاتون ہو کر لاکھوں سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور جیت گئی۔

اس نے اپنے شوہر کو تشفی دی اور کھانا کھانے پر مائل کیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھی بائبل پڑھتی رہی حتیٰ کہ وہ سو گیا۔

اس نے باغی جرنیلوں سے درخواست کی کہ وہ چین کو دوبارہ خانہ جنگی کی آگ میں نہ جھونکیں۔ کیونکہ جب وہ ننکنگ سے چلی تھی تو حکومت کی فوجوں نے پیش قدمی شروع کر دی تھی۔

باغی جرنیلوں نے چیانگ کائی شیک کو کرسمس کے دن رہا کر دیا۔ اس واقعہ پر سارے چین میں خوشی منائی گئی۔ چین اب پھر متحد ہو چکا تھا۔ ایک چینی لڑکی اور اس کے شوہر کی قیادت میں غدار اور محب الوطن، اشتراکی اور سرمایہ دار سب دوبارہ متحد ہو چکے تھے۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل مارک کلارک

اس نے ثابت کر دیا کہ انسان کو عظیم بنانے والی صلاحیتوں کا سکول یا کالج کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کیا سکول کے زمانے میں آپ کند ذہن اور بے مغز تھے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو اپنی کرسی ذرا میرے قریب کھینچ لیں۔ میں آپ کو ایک حوصلہ افزا خبر سنانے والا ہوں۔ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں۔ جس نے 1917ء میں امریکن ملٹری اکیڈمی سے گریجویشن کی سند حاصل کی اور ایک سو انتالیس طلبا میں سے اس کی حیثیت ایک سو گیارھویں تھی۔ یعنی فقط اٹھائیس طلبا نے اس سے کم نمبر حاصل کئے تھے اور ایک سو دس طلبا نے اس سے زیادہ۔

اس کے باوجود چھبیس برس بعد وہ امریکی فوج کا سب سے جوان لیفٹیننٹ جنرل تھا۔ دراصل لیفٹیننٹ کرنل سے لیفٹیننٹ جنرل کے منازل اس نے حیرتناک سرعت سے فقط دو برس میں طے کئے اس کا نام کلارک ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل مارک وین کلارک۔ اخبارات میں اس کا نام ہمیشہ مارک ڈبلیو کلاک شائع ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بیوی اور اس کے قریبی احباب اسے ہمیشہ اس کے درمیانی نام وین سے بلاتے ہیں۔

جب 11- ستمبر 1943ء کو جنرل کلارک نے اپنی فوجیں سیلر (اٹلی) کے ساحل پر اتاریں تو اس نے جنگ کا ایک مشکل ترین فرض انجام دیا تھا۔ اس وقت ونسٹن چرچل نے کہا تھا "ہم نے اپنی فوج کی سب سے اہم نقل و حرکت کا آغاز کر دیا ہے۔ میرے خیال میں اس سے پہلے تاریخ عالم کی کسی جنگ میں اس وسیع پیمانے پر افواج کی نقل و حرکت نہ ہوئی ہو گی۔"

جنرل مارک کلارک کی زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ جو صلاحیتیں انسان کو دوسرے انسانوں کا راہنما بناتی ہیں۔ انہیں جیومیٹری کے سوالوں یا فرانسیسی گرائمر سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں ایک دفعہ ویسٹ پوائنٹ گیا۔ اور وہاں ساری دوپہر جنرل مارک وین کلارک کے بیٹے بل کلارک سے گفتگو میں گزاری۔ بل کلارک نے مجھے بتایا کہ ہر کوئی اس کے والد کو پسند کرتا ہے۔ اسے ملتے ہی لوگ اسے پسند کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں فوراً محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی انہیں پسند کرتا ہے جنرل کلارک اس گرمجوشی سے آپ کا استقبال کرتا ہے۔ جو کسی کتے کے پلے میں پائی جاتی ہے۔ جب وہ آپ سے ہاتھ ملاتا ہے تو اس میں خلوص کی رمق ہوتی ہے۔

ایک فوجی راہنما کی حیثیت سے جنرل مارک کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں میں موزوں دلچسپی لیتا ہے اس کے بیٹے نے مجھ سے کہا۔ "میرے والد نے زندگی میں کبھی کوئی دشمن نہیں بنایا۔ میں نے کبھی کسی کو ان کے خلاف ایک لفظ کہتے ہوئے نہیں سنا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کسی شخص پر غصہ آ جائے۔ ممکن ہے کہ اسے کسی شخص کا کوئی کام ناپسند ہو۔ لیکن وہ کبھی کسی شخص سے نفرت نہیں کرتا۔" اس حقیقت کی وضاحت کے لئے بل کلارک نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ "ایک دفعہ میرے والد نے میری سالگرہ پر مجھے ایک خوبصورت طلائی گھڑی بطور تحفہ دی۔ ایک سال یا کچھ عرصہ بعد وہ گھڑی کسی نے ورزش گاہ سے میری جیکٹ سے نکال لی۔ اس زمانے میں ہم فورٹ لیوس، واشنگٹن میں قیام پذیر تھے۔ میرے والد کئی ماہ تک سیکنڈ ہینڈ اشیاء خریدنے اور فروخت کرنے والے کباڑیوں کی دکانوں کا طواف کرتے رہے۔ جب چور نے وہ گھڑی ایک دکاندار کے پاس گروی رکھی تو پکڑا گیا۔ وہ ایک سپاہی تھا اس کا یہ مطلب تھا کہ اس کا کورٹ مارشل ہو گا۔ اور اسے فوج سے نکال دیا جائے گا۔ والد جانتے تھے کہ اس کا ریکارڈ عمر بھر کے لئے خراب ہو جائے گا۔ لیکن والد کا دل اس قدر نرم تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنا الزام واپس لے لیا اور کمپنی کے کمانڈر سے کہہ دیا کہ وہ اس سپاہی کو چھوٹی موٹی سزا دے کر معاملہ ختم کر دے۔"

جنرل مارک کلارک کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو۔ اسے دوسروں کے لئے چھوٹے موٹے اچھے کام کرنے کا وقت مل ہی جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کی بے حد مصروفیتوں کے باوجود اپنے احباب کو ان کی سالگرہ کے موقع پر پیغام بھیجنا نہ بھولتا تھا۔

جب میں نے بل کلارک سے پوچھا کہ اس کا والد ایسے کام اکثر کرتا ہے تو اس نے

جواب دیا "جی ہاں۔ والد صاحب دوسروں کی اچھائی کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ اور یہ انسانی فرض انجام دینے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں کھوتے۔"

جنرل کلارک مارک کی گھریلو زندگی بے حد متوازن اور پر مسرت ہے۔ بل کلارک نے مجھے بتایا کہ اس کے باپ کو خود کھانا پکانے سے بڑی رغبت ہے وہ اکثر اپنی بیوی کو کچن سے نکال کر خود کھانا پکانے بیٹھ جاتا ہے' اور کھانا پکانے کے بعد خود سب کے سامنے لا کر رکھتا ہے۔ لڑکیو! ذرا یہ بات بھی سنو۔ وہ خود برتن صاف کر کے انہیں دھوپ میں خشک کرتا ہے۔ ایسا شوہر اس بیوی کے لئے برا نہیں۔ جس کی ملاقات اپنی بیوی سے اس طرح ہوئی کہ اس کے ایک دوست نے اسے بتایا کہ اس کی محبوبہ اسے ملنے آ رہی ہے اور اس کے ہمراہ ایک اور لڑکی بھی ہو گی۔

اس لڑکی سے مارک وین کلارک کی ملاقات بیس برس پہلے ہوئی تھی وہ انڈیانہ کی رہنے والی تھی اور اس کا نام موراٹن دوڑن تھا۔ یہ پہلی نظر میں محبت والا معاملہ نہ تھا۔ شروع شروع میں انہوں نے ایک دوسرے میں بہت کم دلچسپی لی۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک دفعہ وین کے والدین کے ہمراہ پانامہ ضرور گئی تھی۔ وہاں ایک جہاز ران اس کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا اور اس نے اسے شادی کا پیغام دے دیا' جب وہ نیویارک واپس آئی تو مارک کلارک تک یہ غمناک خبر پہنچ گئی۔ موراٹن کی منگنی کسی دوسرے شخص نے مجھے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا "چند روز بعد اس نے بھی مجھے شادی کی پیش کش کر دی اور میں نے قبول کر لی" مارک کلارک کے ہر میز پر اس کی بیوی اور دونوں بچوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

جنرل مارک کلارک ہر بات میں درستی اور صحیح پن کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسز کلارک ہر ماہ گھریلو اخراجات کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے اگر چند پیسوں کا بھی فرق پڑ جائے تو جنرل کلارک گھنٹوں یہ سوچتا رہتا ہے کہ وہ چند پیسے کہاں خرچ ہوئے ہیں۔ اسے ان چند پیسوں کی فکر نہیں ہوتی۔ بلکہ اسے غیر متوازی فیملی بجٹ ہرگز پسند نہیں۔

ایک دفعہ جنرل کلارک کو اس کے بیٹے نے اپنے سکول کی رپورٹ دکھائی جس میں اس نے امتحان میں ننانوے فیصد نمبر حاصل کئے تھے۔ اس نے بل سے پوچھا کہ کیا وہ اس نتیجے پر مطمئن تھا؟ بل نے جواب دیا۔ کیوں نہیں آپ مطمئن ہیں کہ نہیں۔" جنرل کلارک نے

جواب دیا۔ "تمہیں سو میں سے سو نمبر حاصل کرنے چاہئیں تھے۔" اس پر بل نے جواب دیا۔

"ابا جان اگر میں سو میں سے ایک سو دس نمبر حاصل کر لوں تو پھر بھی آپ کو اطمینان نہ ہو گا۔"

میں نے بل کلارک سے پوچھا کہ کیا اس کے والد نے مجھ سے ان کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ امریکن ملٹری اکیڈمی کے زمانے میں اس کا اپنا تعلیمی ریکارڈ کچھ اتنا شاندار نہ ہوتا تھا۔ بل کلارک نے کہا تھا "پہلے مجھے یہ بات معلوم نہ تھی۔ لیکن جب والد صاحب کے پرانے ہم جماعت نے اس کا ذکر کیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔"

جنرل کلارک ایک منکسر انسان ہے اس نے اپنے معرکوں وغیرہ کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ ایک دن جنرل کلارک اپنے بیٹے کی موجودگی میں لباس بدل رہا تھا اپنے والد کی پیٹھ پر کوئی ایک فٹ لمبا زخم کا گہرا نشان دیکھ کر بل کلارک کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے والد نے کبھی اس زخم کا ذکر نہ کیا تھا۔ جب بل نے اس زخم کے متعلق پوچھا تو جنرل کلارک نے سرسری طور پر کہا۔ "گزشتہ جنگ میں یہاں ایک سنگین لگ گئی تھی۔" فقط یہی جواب۔ کوئی تفصیل نہیں۔ اس نے اپنی بہادری کے کبھی گن نہ گائے تھے۔ بل کلارک کو اپنے والد کی بہادری کی خبر ایک کتاب کے مطالعہ سے ہوئی۔ جس میں جنرل کلارک کو اس کی بہادری کے عوض تمغے وغیرہ ملنے کا ذکر کیا گیا تھا۔

جنرل مارک کلارک دس برس تک سگریٹ پیتا رہا۔ لیکن پھر اس نے سگریٹ کی بدبو کے متعلق اپنی بیوی کی شکایت پر سگریٹ پینے چھوڑ دیے۔

آپ کے خیال میں اس کا من بھاتا مشروب کیا ہو گا؟ دودھ۔ امن کے دنوں میں وہ دن میں تین مرتبہ دودھ پیتا ہے۔ یعنی چوبیس گھنٹوں میں دو سیر دودھ۔

امریکن ملٹری اکیڈمی کے دنوں میں مارک کلارک ہمیشہ اپنے ہیٹ میں کھانا وغیرہ چھپا کر لے آیا کرتا تھا۔ کیڈٹوں کو میس سے اپنے کمرے میں کھانا لانے کی اجازت نہ تھی۔ مارک وین کلارک کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور اس کی بھوک گھوڑوں اور خچروں جیسی بھوک تھی۔ وہ میس میں اتنا نہ کھا سکتا کہ اگلے کھانے تک وقت گزار سکے۔ لہٰذا وہ اپنے بڑے ہیٹ میں سینڈوچ، گوشت اور کیک ڈال کر اور ہیٹ سر پر رکھ کر اپنے کمرے میں چلا آتا۔ یہ پچیس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

برس پہلے کی بات ہے۔ لیکن جنرل مارک کلارک کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ اس کے والد کی بھوک آج بھی روز اول جیسی ہے۔ اس نے کہا "آپ کو آج بھی اس کے میز پر کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور دکھائی دے گی۔" حقیقت میں جنرل کلارک کی بھوک کچھ اس نوعیت کی ہے کہ جب بھی اسے کسی ڈنر وغیرہ پر مدعو کیا جاتا ہے تو وہ ڈنر کے وقت سے دو گھنٹے پہلے گھر سے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر چلتا ہے۔ شوربے' سینڈوچ' دودھ اور آئس کریم پر مشتمل ہلکا پھلکا کھانا۔ ڈنر کے وقت تک یہ کھانے اسے پریشان نہیں ہونے دیتا۔

اس کا محبوب کھانا' گوشت کی ران اور ابلے ہوئے آلو ہیں وہ کھانے میں اس قدر دلچسپی لیتا ہے کہ وہ ایک تجربہ کار باورچی بن گیا ہے۔

بل کلارک نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ فریب دہی اور جھوٹ کے سوا ہر خطا معاف کر دیتا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہہ رکھا ہے۔ "بل! ہمیشہ سچ بولو اور کسی حال میں سزا یا بے عزتی کے خوف سے کوئی ناخوشگوار بات کہنے سے نہ جھجکو۔"

ویسٹ پوائنٹ سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے بل کلارک سے پوچھا۔ "اب تک آپ مجھے اپنے والد کی شخصیت کے اچھے پہلو بتاتے رہے ہیں۔ اب ذرا ان کے عیوب اور خامیوں کا ذکر بھی کر دیں۔"

بل نے جواب دیا "وہ ذرا تنک مزاج واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی ناراضی کی مدت بڑی مختصر ہوتی ہے۔ وہ زیادہ عرصہ تک اس سے نباہ نہیں کر سکتے۔ ان کا دل اس قسم کا نہیں ہے۔ ناراضی کے بعد وہ ہمیشہ معافی مانگ لیتے ہیں۔ اور تلافی کے طور پر آپ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

جنرل کلارک کتوں کا بے حد شوقین ہے۔ اس نے مختلف نسلوں کے سات آٹھ کتے پال رکھے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دعوت کے موقع پر ایک کتے نے ایک مہمان خاتون کی چادر پھاڑ دی۔ اس پر جنرل کلارک نے غصے میں آکر اسے سزا دی۔ بل کلارک نے مجھے بتایا کہ مہمانوں کے رخصت ہو جانے پر "اسی رات جب وہ کسی کام سے کمپنی میں گیا تو وہاں اس نے دیکھا کہ اس کا والد اس کتے کو گود میں لئے پیار کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ "بیٹے مجھے بے حد افسوس ہے مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ اب میں آئندہ تمہیں کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ایک دن بل کلارک اپنے باپ کے کمرے میں گیا۔ تو وہاں اس نے میز پر ایک کھلی کتاب دیکھی۔ اس کتاب کا نام "روزمرہ کے الفاظ" تھا۔ وہ کتاب انجیل کے موثر پیغاموں کا مجموعہ تھی۔ بل کلارک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اس نے اپنے والد کو کبھی کوئی مذہبی بات کہتے ہوئے نہ سنا تھا۔ اس نے اپنی والدہ سے اس کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔ "تمہارا والد اکثر انجیل کا مطالعہ کرتا ہے اور ہر رات سونے سے پہلے دعا ضرور مانگتا ہے۔"

جس روز پانچویں فوج اٹلی میں داخل ہوئی' اس روز جب جنرل مارک کلارک نے "روزمرہ کے الفاظ" کھولی۔ تو اس میں ذیل میں لکھا ہوا شعر درج تھا۔

اگرچہ تم ہزاروں دشمنوں میں گھرے ہو گے
لیکن تمہاری حفاظت کے لئے میں موجود ہوں/ گا

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل ڈوائٹ آئزن ہاور

اس کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں اس سے بہتر کوئی شخص آلوؤں کا سلاد اور ترکاری کا شوربہ تیار نہیں کر سکتا۔

موجودہ صدی کے ابتدائی زمانے میں کسی ہائی سکول کا ایک لڑکا ایک دن ریاست کنساس کے ایک ہفت روزہ اخبار کے دفتر میں گیا اس ہفت روزہ اخبار کا نام "نیوز" تھا۔ وہاں ایڈیٹر کے میز پر ایک کتاب پڑی تھی وہ کتاب عظیم فوجی شخصیت "ہنی بال" کی زندگی کے متعلق تھی' جب لڑکے نے کتاب پڑھنی شروع کی۔ تو وہ ہنی بال کی معرکہ خیز زندگی میں مکمل طور پر گم ہو گیا ہنی بال جس نے کوہ ایلپس کو ہاتھیوں کے ذریعے عبور کیا تھا اور جو پندرہ برس تک اطالیوں سے لڑتا رہا تھا۔ کنساس کے اس لڑکے کو فوجی تاریخ نے اس قدر مسحور کیا کہ اس نے گبن کی "سلطنت روم کا زوال" کتاب ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ اس کے بعد وہ کئی ماہ تک امریکی تاریخ کا مطالعہ کرتا رہا۔ لی گرانٹ' واشنگٹن اور سٹون وال جیکسن کی سوانح عمریوں نے اسے بیحد متاثر کیا۔ اسے تاریخ خصوصاً فوجی تاریخ سے اس قدر لگاؤ پیدا ہو گیا کہ اس کے سکول کی سالانہ کتاب میں اس کے متعلق یہ پیش گوئی کی گئی کہ ایک روز وہ ژیل یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر بنے گا۔ لیکن یہ پیش گوئی تھوڑی سی غلط ثابت ہوئی اس نے ژیل مین کبھی تاریخ نہ پڑھائی۔ بلکہ اس نے خود ایسی تاریخ بنائی جسے کئی برس تک ژیل میں پڑھاتے رہیں گے۔ اس نے ایسی تاریخ کی طرح ڈالی ہے جس کا اثر ہنی بال اور اس کے ہاتھیوں سے کہیں زیادہ انسانی زندگی پر ہو گا۔ اس لڑکے کا نام ڈوائٹ ڈیوڈ آئزن ہاور تھا۔ اس کے قریبی دوست اسے "آئک" کے نام سے بلاتے ہیں۔

کنساس کے کھیتوں سے آنے والے اس لڑکے نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اتحادی فوجوں کی شاندار قیادت کر کے تین کروڑ یورپین باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ 5- جون 1944ء کے صبح کے چار بجے تھے کہ جنرل آئزن ہاور نے دوسرے دن یورپ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس نے انگلینڈ کے ایک مکان میں بیٹھ کر کیا تھا۔ یہ فیصلہ اس

نے ہوائی ،بحری اور بری فوجوں کے افسران اعلیٰ اور موسمی تجربہ کاروں سے مشورہ کرنے کے بعد کیا تھا۔ دو دن پہلے جنرل آئزن ہاور نے فوری حملے کا حکم دے دیا لیکن نصف گھنٹے بعد اسے یہ حکم منسوخ کرنا پڑا تھا۔ موسم ایک دم بدل گیا تھا۔ لیکن اب موسم پھر مہربان ہو گیا تھا۔ مزید دیر حملے کے لئے بالکل تیار فوجوں میں قدرے بے دلی پیدا کر سکتی تھی۔ آخر تمام حالات کا بغور جائزہ لینے کے بعد جنرل آئزن ہاور نے کہا "ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے خیال میں ہمیں حملہ کر دینا چاہئے۔"

یہ ایک جملہ جو کسی قسم کی ولولہ انگیزی کے بغیر کہا گیا تھا۔ تاریخ عالم کے سب سے بڑے فوجی حملے کا سبب بنا۔ آئزن ہاور جو بچپن میں کنساس میں اپنے فارم پر برتن صاف کیا کرتا تھا اور بھینسوں کا دودھ دوہتا تھا۔ اسے اتنا بڑا اختیار دیا گیا تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اسے تمام محاذوں پر اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بننا تھا۔ اس کی زیر کمان اتنی بڑی فوج تھی۔ جو نپولین جولیس سیزر اور شارلیمان کی متحدہ فوج سے بھی کہیں زیادہ تھی وہ ایک ایسے بحری بیڑے کا انچارج تھا جو نیلسن' ہاکنز ڈریک' جون پال جونز اور ایڈمرل ڈیوس کے متحدہ جنگی بحری بیڑے سے بڑا تھا۔ جہاں تک ہوائی فوج کا تعلق ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ وہ اتنی بڑی ہوائی فوج کا کمانڈر بنے گا۔

اس کے باوجود وہ اتنی بڑی ذمہ داری سے ایسی تحمل مزاجی سے عہدہ برآ ہوا جو برسوں کی تربیت' ہر چھوٹی تفصیل کی مکمل تیاری اور سامان جنگ کی طرف سے پورے اطمینان کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

فوجی کامیابی سے متعلق اس کا نسخہ بڑا سادہ ہے۔ وہ کہا کرتا ہے۔ "چھوٹی چھوٹی تفصیل تک مکمل تیاری کریں اور پھر موت کی طرح حملہ آور ہو جائیں۔" اس کے ماہرین نے اس کے حکم کے مطابق ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کی مکمل تیاری کی تھی۔ مثال کے طور پر اس حملے نے بحری فوج نے جو حصہ لیا۔ اس کی منصوبہ بندی آٹھ سو صفحات پر مشتمل تھی اور اس حملے کے متعلق بحری فوج نے جو نقشے تیار کئے ان کا وزن تین سو پونڈ تھا۔

اٹھائیس برس قبل آئزن ہاور کا نام ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں تانبے کے ایک چھوٹے میز پر کندہ کیا گیا تھا۔ یہ اعزاز اسے فٹ بال کا نمایاں کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے ملا تھا۔ اسے کنساس کا طوفان کہا جاتا تھا۔ وہ فٹ بال کے میدان میں ایک طوفانی موج کی طرح حملہ آور ہوتا اور ہر کھلاڑی کو اپنے راستے سے ہٹا دیتا۔ آخر ایک کھیل میں اس کا گھٹنہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

گیا اور اس نے فٹ بال کھیلنا ترک کر دیا۔ یورپ میں اس کی فوجی زندگی کا اختتام ہٹلر کی تباہی سے ہوا۔

جب حملہ آور فوجیوں کے لئے سپریم کمانڈر منتخب کرنے کا وقت آیا تو جنرل آئزن ہاور پہلا انتخاب تھا۔ اس انتخاب پر فقط روز ویلٹ اور ونسٹن چرچل ہی متفق نہ تھے۔ بلکہ سٹالن نے بھی اتفاق کیا تھا۔ حقیقت میں آئزن ہاور کی میز پر وہ خط ہمیشہ پڑا رہتا تھا جو صدر روز ویلٹ نے اپنے ہاتھ سے سٹالن کو لکھا تھا اور جس میں اس نے سٹالن کو یہ یقین دلایا تھا کہ جنرل آئزن ہاور ہی اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر ہو گا۔

اس کے باوجود جب چونتیس برس پہلے آئزن ہاور نے ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں جانے کا خیال ظاہر کیا تو اس کے والدین کو صدمہ ہوا۔ آئزن ہاور کا خاندان کئی نسلوں سے اسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا ہے جو ہر قسم کی جنگ کے خلاف ہے۔ اس فرقے کا نام "یسوع مسیح کے متحدہ بھائی" ہے آئزن ہاور کا دادا ایک گرجے میں پادری تھا اور جرمنی زبان میں وعظ کیا کرتا تھا۔ اس کے والد اور والدہ کی پہلی ملاقات بھی یسوع مسیح کے متحدہ بھائیوں کے قائم کئے ہوئے ایک چھوٹے سے کالج میں ہوئی تھی۔ لہٰذا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اپنے بیٹے کے سپاہی بننے کے ارادے پر انہیں کس قدر صدمہ ہوا ہو گا۔ لیکن آئزن ہاور تہیہ کر چکا تھا اور والدین کی ترغیب اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کر سکی۔

پہلے وہ اینا پولس کی نیوی اکیڈمی میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے بچپن کا دوست ایورٹ ہیزلٹ وہاں جا رہا تھا اور آئزن ہاور' بلاشبہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے وہ وہاں نہ جا سکا۔ وہ اپنی بارھویں سالگرہ منانے کے بعد امتحان دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن جب وہ اپنی سالگرہ منا چکا تو اسے پتہ چلا کہ اب اس کی عمر زیادہ ہو چکی ہے اور وہ اس امتحان میں نہیں بیٹھ سکتا۔

فوج میں جنرل آئزن ہاور کی حیرتناک ترقی کی وجہ سے اس کا علم اس کی تربیت' اس کی قوت فیصلہ' اس کا کردار اور سب سے بڑھ کر آدمیوں کی قیادت کے سلسلے میں اس کی قابلیت تھی۔ ایک راہنما کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ "ایک ایسا انسان جو دوسرے لوگوں کو کسی سزا کے خوف یا کسی انعام کی امید کے بغیر کوئی کام کرنے کی ترغیب دے سکے۔" آئزن ہاور میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ہر کوئی اسے پسند کرتا تھا۔ وہ اس چیز کا مالک تھا جسے عام الفاظ میں شخصیت کہا جاتا ہے۔

اس کی بیوی اس کے متعلق کہتی ہے۔ "آئیک کے لبوں پر ایک سدا بہار مسکراہٹ رہتی ہے۔ وہ ایک بہترین گفتگو کرنے والا ہے۔ وہ تقریباً ہر چیز کے بارے میں علم رکھتا ہے اس کی گفتگو سننا ایک نعمت سے کم نہیں۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے کئی برس گزر گئے ہیں۔ لیکن آج بھی میں اس میں پہلے جیسی دلکشی پاتی ہوں۔"

ونسٹن چرچل نے ایک مرتبہ آئزن ہاور سے کہا تھا "آئیک! تم میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم شہرت کے بھوکے نہیں ہو۔" یہی الفاظ آئزن ہاور نے ایک دفعہ شمالی افریقہ میں ایڈمرل چو نگھم کی موجودگی میں ایک دوسرے افسر کو کہے تھے۔ بعد میں یہی الفاظ ایڈمرل چو نگھم نے چرچل سے کہے اور چرچل نے آئزن ہاور کے یہ الفاظ حفاظت سے اس تک پہنچا دیئے۔

ڈوائٹ آئزن ہاور یقیناً شہرت کا بھوکا نہیں اس نے کبھی شعوری طور پر سامنے آنے کی کوشش نہیں کی۔ ابراہام لنکن کی طرح اس نے بھی کبھی ذاتی شہرت کی پرواہ نہیں کی۔ وہ اپنی وردی پر امتیازی تمغے وغیرہ لگانے سے انکار کر دیتا ہے۔ جب وہ انگلینڈ میں تھا تو دعوتوں وغیرہ میں بہت کم جاتا اس نے اصرار کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر کا نام "آئزن ہیڈ کوارٹرز" کی بجائے "اتحادی' فوجوں کا ہیڈ کوارٹرز" رکھوایا تھا۔

وہ شراب نہیں پیتا' وہ کہا کرتا ہے کہ اس کے ذہن میں اتنی خفیہ اور اہم باتیں ہوتی ہیں کہ اگر وہ شراب پینے لگے تو ممکن ہے۔ شراب کے اثر کے تحت اس کی زبان اس کے قابو سے باہر ہو جائے امن کے دنوں میں وہ جی کھول کر برج اور پوکر کھیلتا ہے اور ہمیشہ جیتتا ہے۔

فوجی تاریخ کے متعلق اس کا علم بے حد وسیع اور صحیح ہے۔ شمالی افریقہ کے محاذ پر کسی نے اس سے اٹلی پر ہنی بال کے حملے کے متعلق پوچھا تو آئزن ہاور 40 منٹ تک ہنی بال کے حملے کی تفصیلات کی وضاحت کرتا رہا۔ اس کے سننے والے حیران رہ گئے۔ سامعین میں سے ایک کا خیال تھا کہ آئزن ہاور ایک ایسی جنگ کی تمام تفصیلات صحیح طور پر یاد نہیں رکھ سکتا۔ جو حضرت مسیح کی پیدائش سے دو سو برس پہلے لڑی گئی تھی۔ لیکن جب اس نے حقائق پرکھے تو آئزن ہاور کی ہر بات صحیح نکلی۔ ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی سے نکلنے کے بعد آئزن ہاور زیادہ تر فالتو وقت فوجی تاریخ کے مطالعہ اور فوجی مسائل حل کرنے میں صرف کیا کرتا تھا۔

وہ ایک تیز قاری ہے۔ اس کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ امن کے دنوں میں جنرل آئزن ہاور ایک رات میں کئی رسالے پڑھ ڈالتا ہے لیکن جنگ کے دوران میں جب وہ تمام اتحادی فوجوں کی کمان سنبھالنے کے لئے انگلینڈ گیا۔ تو اس کے پاس فقط ایک کتاب تھی اور وہ تھی بائیبل۔

آئزن ہاور ہر روز عموماً سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کے لئے پانچ گھنٹے کی نیند کافی ہوتی ہے۔ پو پھوٹتے ہی اس کی آنکھ کھل جاتی ہے لیکن یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ جب وہ ایک لڑکا تھا تو اس زمانے میں بھی وہ سردیوں میں صبح ساڑھے چار بجے اٹھ جایا کرتا تھا۔ تمام گھر سردی سے منجمد ہوتا اور تھرما میٹر صفر درجہ حرارت سے بیس درجے نیچے ہوتا۔ وہ اٹھ کر کچن میں جاتا۔ آگ روشن کرتا اور سارے کنبے کے لئے ناشتہ تیار کرتا۔

کھانا پکانے کا ذکر آگیا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ جنرل آئزن ہاور بے حد خوش خوراک ہے۔ اس کی ماں کے چھ بیٹے اور کوئی بیٹی نہ تھی۔ لہٰذا اسے اکثر اپنی والدہ کے ہمراہ کچن میں کام کرنا پڑتا۔ جون آئزن ہاور نے مجھے بتایا کہ اس کے والد کو اپنی کھانا پکانے کی قابلیت پر بڑا فخر ہے۔ خصوصاً آلوؤں کا سلاد اور ترکاری کا شوربہ پکانے کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر میں اس سے بہتر کوئی شخص ترکاری کا شوربہ نہیں بنا سکتا۔ اکثر وہ اپنی بیوی کو کچن سے چھٹی دے کر خود کھانا پکانے میں جٹ جاتا ہے کھانا تیار کرنے کے بعد وہ اسے میز پر لگاتا ہے اور بعد میں برتن بھی خود ہی صاف کرتا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر اگر اس کی بیوی اسے خوش گفتار خیال کرتی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں جنرل آئزن ہاور نے کچھ زیادہ نمبر حاصل نہ کئے تھے۔ 164 لڑکوں میں سے اس نے 61 ویں پوزیشن حاصل کی تھی۔ لیکن اچھی پوزیشن سے بڑھ کر اس نے ویسٹ پوائنٹ میں ایک اور اہم چیز حاصل کر لی تھی اور وہ تھی دور اندیشی۔ اسے دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے پہلے کئی برس پہلے ہی ایک دوسری جنگ کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ ہوائی جہاز اور ٹینک آئندہ جنگی معاملات میں بے حد اہمیت اختیار کر جائیں گے۔ وہ ہوائی فوج میں شریک بے حد اہمیت اختیار کر جائیں گے۔ وہ ہوائی فوج میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ مگر اپنے افسر کے اعتراض پر ایسا نہ کر سکا۔ آخر وہ ٹینکوں میں چلا گیا اور اس نے امریکی فوج میں ٹینکوں کے پہلے ڈویژن کی تشکیل کی۔ جب وہ اٹھائیس برس کا تھا تو اسے ٹینکوں کے ڈویژن کا لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا وہ اور اس کا ٹینک

یونٹ گیارہ نومبر 1918ء میں یورپ کے سفر پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھا کہ اچانک جنگ بند ہو گئی۔

میں آپ کو جنرل آئزن ہاور کے متعلق ایک انوکھی بات بتاتا ہوں۔ اگرچہ اس نے ہوائی، بحری اور بری فوجوں کی مشترکہ قیادت کی ہے لیکن وہ بذات خود کبھی کوئی فوجی دستہ لے کر میدان جنگ میں نہیں لڑا۔ لاکھوں سپاہیوں کو جنرل آئزن ہاور سے زیادہ میدان جنگ کا تجربہ ہے۔ جنرل آئزن ہاور کبھی برستے بموں اور گونجتی گولیوں کی بوچھاڑ میں نہیں گیا۔ اس کا کام محاذ جنگ پر لڑنے والے جرنیلوں کو ضروری ہدایات جاری کرنا رہا ہے۔

جنرل آئزن ہاور کا حقیقی نام ڈوائیٹ ڈیوڈ آئزن ہاور ہے اس کی والدہ کو اس کے مختصر نام "آئیک" پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے۔ ایک دفعہ جب جنرل آئزن ہاور کی بیوی نے اپنی ساس کو ایک خط لکھا کہ "وہ اور آئیک اس کے پاس آ رہے ہیں۔" تو آئزن ہاور کی والدہ نے اسے جوابی خط لکھتے ہوئے کہا کہ وہ ان کا انتظار کرے گی۔ لیکن وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آئیک کون ہے جو ان کے ساتھ آ رہا ہے۔

جنرل آئزن ہاور کی والدہ جو اب خاصی بوڑھی ہو چکی ہے آج بھی آ بیلین میں رہتی ہے۔ ایک دن وہ اپنے مکان کے دریچے میں سے کچھ سپاہیوں کو گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی ساتھی عورت سے کہا۔ میرا بھی ایک لڑکا فوج میں ہے۔

"ہاں مسز آئزن ہاور! یقیناً آپ کا ایک بیٹا فوج میں ہے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لوول جیکسن ٹامس

اس کے قرض خواہ غضب ناک حالت میں اس کے پاس آتے مگر اس سے ملنے کے بعد خود کو اس کا گہرا دوست محسوس کرتے۔

1916ء کے موسم بہار کے ایک دن میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ایک شخص نے جو قانون کا طالب علم تھا اور پرنسٹن یونیورسٹی میں استاد تھا۔ مجھ سے ملاقات کے لئے وقت مانگا۔ وہ الاسکا پر ایک مصور تقریر کی تیاری میں کسی کی مدد کا طلب گار تھا۔ جب دوسرے دن ہماری ملاقات ہوئی تو میں اس سے بہت متاثر ہوا اس نوجوان میں مجھے وہ تمام باتیں دکھائی دیں جو کامیابی کے لئے ضروری ہوتی ہیں مثلاً دلکش شخصیت، ولولہ انگیزی، حیرت ناک قوت کار اور آگے بڑھنے کی بے پناہ خواہش۔ میں نے پیش گوئی کی کہ کسی روز وہ نوجوان دولتمند اور نامور ہو گا۔

میری پیش گوئیاں اکثر غلط ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اتفاق سے وہ صحیح ثابت ہوئی۔ وہ نوجوان بذات خود ایک ادارہ بن گیا۔ جہاں تک امارت کا تعلق ہے "ٹائمز میگزین" نے ایک دفعہ اندازہ کیا تھا کہ اس کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار پونڈ کے لگ بھگ ہے۔

اس کا نام لوول جیکسن ٹامس ہے لیکن اس کی بیوی اور اس کے قریبی دوست اسے "ٹومی" کہہ کر بلاتے ہیں۔ ٹومی 1930ء سے لگاتار ہفتے میں پانچ دفعہ مشرقی امریکہ کے لئے خبریں نشر کرتا ہے۔ ریڈیو کی دنیا میں یہ ایک ریکارڈ ہے اور 1934ء سے فاکس مووی ٹون نیوز ریل کے ذریعے سے وہ ہر ہفتے یہ سب خبریں نشر کرتا ہے۔

اس سارے عرصے میں وہ خبروں کے اختتام پر "اچھا کل تک کے لئے خدا حافظ" کہتا رہا ہے۔ اس کی زبان سے اس قدر الفاظ نکل چکے ہیں کہ ان سے ایک سو کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

جب میں پہلی دفعہ لوول جیکسن سے ملا تو اس زمانے میں وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں ملازمت کے علاوہ چند شلنگ فی شب کے معاوضے پر الاسکا پر سفری تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس نے گمنامی سے ترقی کے زینے کی آخری سیڑھی تک جس طرح سفر طے کیا ہے۔ میں اس

سے بخوبی واقف ہوں۔ اس کے باوجود وہ پہلے کی طرح منکسر مزاج تصنع سے مبرا اور خلوص کا مجسمہ ہے۔ اس سارے عرصے میں میں نے کسی شخص کو لوول جیکسن کی کسی بات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں دنیا میں ایک شخص بھی اس کا دشمن نہیں۔

لوول ٹامس کی زندگی پر اس کے والد اور والدہ کا گہرا اثر ہے۔ دونوں استاد تھے۔ لیکن بعد میں اس کا والد تدریس چھوڑ کر ادویات کی طرف آ گیا اس کے والد کی عمر اگرچہ اب ستر برس سے اوپر ہے۔ پھر بھی وہ جرمنی میں میڈیکل پریکٹس کر رہا ہے۔

جب ٹومی ایک لڑکا تھا تو مارکوپولو' میگیلاں۔ ڈینئل بون اور رابنسن کروسو کی کہانیوں اور ان کی مہمات نے اس کے تصور کو پر لگا دیئے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی ایک دن دنیا کے آخری کنارے تک سفر کرے گا۔ اور اپنی داستانیں کتابوں میں چھوڑ جائے گا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو لوول ٹامس کی طرح اپنے خوابوں کو ٹھوس حقائق میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس نے یورپ' ایشیا' الاسکا اور آسٹریلیا کی جادہ پیمائی میں کئی برس صرف کیے۔ اس نے پرنس آف ویلز کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا وہ پہلا شخص تھا جسے سرکاری طور پر افغانستان کا دورہ کرنے اور وہاں فلم تیار کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ہندوستان' برما اور ملایا نے اپنے رسم و رواج کے بارے میں فلمیں بنوانے کے لئے لوول جیکسن کو خاص مراعات دیں اور ہاتھیوں اور کشتیوں کا ایک قافلہ اس کے سپرد کر دیا۔

اس نے چالیس سے اوپر کتابیں لکھی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کتابوں کے عنوان بھی مہماتی قسم کے ہیں۔ مثلاً عرب میں لارنس کے ساتھ۔ "درہ خیبر سے پرے۔ یہ لوگ کبھی نہ مریں گے" وغیرہ۔

جب وہ ایک لڑکا تھا تو سفر کرنے کی خواہش کے دوش بدوش وہ ان سفروں کے بارے میں تقریریں کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ جانتا کہ اس خواہش کی تکمیل کے لئے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس نے وسیع پیمانے پر تعلیم پائی اور چار یونیورسٹیوں سے چار سندیں حاصل کیں۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے پاس تو ایک یونیورسٹی میں بھی تعلیم پانے کے لئے پیسے نہ تھے۔ لہٰذا وہ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران مویشی چرانے کا کام کرتا اس نے کولوریڈا میں سونے کی کانوں میں بھی کام کیا۔ بعد میں وہ شکاگو اور ڈن ور کے اخباروں کے لئے بطور رپورٹر کام کرتا رہا۔

موسم سرما میں وہ اپنی رہائش اور خوراک کے اخراجات ایک ہوٹل میں بہرے کا کام کر کے اور اپنے ایک پروفیسر کی گائیں دوہ کر پورے کرتا۔ اس کے علاوہ اسے ایک آدھ ٹیوشن مل جاتی اور وہ کبھی کبھار کہیں کوئی لیکچر بھی دے دیتا۔

1915ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران یورپ کی طرف کوئی سیاح نہ جا سکتا تھا۔ اس بات نے لوول ٹامس کو ایک خیال سجھا۔ وہ امریکہ کے خوبصورت اور حیرت ناک فطری مناظر پر تقریریں کیوں نہ تیار کرے؟ خیال تو اچھا تھا۔ لیکن اسے لباس عمل پہنانے کے لئے ریل کے کرائے ہوٹل کے اخراجات اور سامان فوٹوگرافی کی ضرورت تھی۔ لوول ٹامس کے پاس روپیہ تو نہ تھا۔ مگر اس کا اثاثہ ایک ایسی ولولہ انگیزی ضرور تھی۔ جس نے اسے امریکہ کا بہترین سیلزمین بنا دیا۔ اس نے ریلوے اور بحری جہازوں کی کمپنیوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسے خاص رعایت دیں' میں نے الاسکا پر ٹومی کا لیکچر سنا تھا جو بڑا دلچسپ اور رواں دواں تھا۔ اس کی اتاری ہوئی تصویریں بھی بہت اچھی تھیں۔

صدر ولسن کی کابینہ کے داخلی امور کے سیکرٹری' فرینکلن' کے' لین نے بھی وہ تقریر سنی تھی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوا' جب 1917ء میں امریکہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تو لینن نے صدر ولسن کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ لوول ٹامس کو جنگ کی تصویریں لینے کے لئے باہر بھیجا جائے اور امریکی افواج کا حوصلہ بلند کرنے کے لئے انہیں وہ تصویریں دکھائی جائیں۔

لیکن اس پروگرام میں ایک خامی تھی اور وہ بھی نہایت سنجیدہ نوعیت کی یہ اعزازی کام تھا اور اس کے لئے سفر خرچ بھی ملنا تھا۔

لہٰذا لوول ٹامس نے شکاگو کے اٹھارہ امیر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کی اس مہم میں مدد کریں اور پہلی جنگ عظیم کی تصویریں اتارنے کے لئے اسے 20'000 پونڈ قرض دیں۔ اٹھارہ ماہ بعد جب وہ امریکہ واپس آیا تو اس کے پاس فرانس' بلجیم' اٹلی اور بلقان کے محاذوں کی رنگین تصویریں تھیں اس کے علاوہ سنسنی خیز بات یہ تھی کہ وہ اپنے ہمراہ لارنس آف عریبیا کی مکمل کہانی بھی لایا تھا۔ لارنس آف عریبیا جس نے عرب شیخوں کو متحد کر کے چھاپہ مار لڑائی کے لئے تیار کیا اور جنہوں نے ترکی ریلوے کے ذرائع آمدورفت بارود سے اڑا دیئے۔

لوول ٹامس کی مصور تقریریں نیویارک کے سب سے بڑے تھیٹر میں مہینوں دکھائی جاتی رہیں۔ بعد میں اسے لندن مدعو کیا گیا جہاں اس نے برطانوی عوام کو مشرق قریب میں ان کی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اپنی حیرت ناک تحریک کی داستان سنائی۔

اس زمانے میں ایک قسم کے کاروبار کے سبب مجھے لوول ٹامس سے وابستہ رہنے کا فخر حاصل ہے۔ میں نے دیکھا کہ لندن کے لوگ اس کی تقریر سننے کی خاطر ٹکٹ لینے کے لئے گھنٹوں قطار میں کھڑے رہتے تھے۔ وہ کوونٹ گارڈن اوپرا ہاؤس میں لیکچر دیا کرتا تھا۔ ٹکٹوں کی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ اوپرا کا موسم شروع ہونے کے باوجود اسے ایک ماہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا تاکہ ٹومی اپنے لیکچروں کا سلسلہ جاری رکھ سکے۔ پھر وہ البرٹ ہال میں لیکچر دینے لگا۔ جہاں ہر روز بیس پچیس ہزار لوگ اسے سننے کے لئے آتے۔ اس سے پہلے لوگوں نے لارنس آف عریبیا کے بارے میں کچھ نہ سنا تھا۔ لوول ٹامس نے انہیں اس کی حیرتناک کہانی سنائی۔

ٹومی دس برس تک دنیا بھر میں یہ مصور تقریریں کرتا رہا۔ اس نے چالیس لاکھ لوگوں سے روبرو باتیں کی تھیں۔

پھر 1930ء میں لوول ٹامس کو زندگی میں ایک سنہری موقع ملا۔ ادبی ڈائجسٹ کے لئے روزانہ خبریں نشر کرنے کا موقع۔ یہیں سے وہ امریکہ کی اہم اور نامور ہستی بن گیا۔ ٹومی ہفتے میں دس پروگرام نشر کرتا اور ہفتے میں دو راتیں فاکس مووی ٹون نیوز ریل میں کامنٹری دیتا اس کے علاوہ وہ ان گنت خطوں کا جواب دیتا اور سال میں ایک یا دو کتابیں بھی لکھتا۔

وہ اتنا سارا کام کس طرح کرتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا عملہ بہت اچھا تھا اور اس نے خود کو ایک تنظیم میں ڈھال لیا تھا۔ ٹومی جانتا تھا کہ ہر منٹ کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ ایک دفعہ میں بھی اس کے ہمراہ لندن میں تھا۔ وہ آسٹریلیا کے دورے پر جا رہا تھا۔ بحری جہاز میں سوار ہونے کے لئے جب وہ بندرگاہ کی سمت جا رہا تھا تو سارے راستے ٹیکسی میں اپنے سیکرٹری کو خط لکھواتا گیا بندرگاہ پر پہنچ کر بھی جہاز روانہ ہونے سے دو منٹ پہلے تک وہ خط لکھوا رہا تھا۔

لوول ٹامس کو کلبوں' پارٹیوں اور ڈنروں وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے مشاغل' گھڑ سواری' سوفٹ بال اور سکیٹنگ ہے۔ سکیٹنگ کا شوق تو جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ زمستان میں بعض اوقات یہ شوق پورا کرنے کے لئے وہ پانچ ہزار میل تک سفر کرتا ہے۔

لوول ٹامس کی بیوی کا نام فرانسس رین ہے دونوں کی پہلی ملاقات ڈن ور یونیورسٹی میں ہوئی۔ ان کا ایک بیٹا ہے۔ لوول ٹامس جونیئر۔ اس میں سیاحت اور سکیٹنگ کا شوق

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اپنے باپ سے بھی زیادہ ہے۔

ایک دفعہ خبریں نشر کرنے کے دوران میں لوول ٹامس کو یکایک احساس ہوا کہ سکرپٹ کے پانچ صفحے غائب ہیں اسے مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے خبریں ختم کرنی پڑیں اور یہ وقت سازینے سے پورا کیا گیا۔ یہ سب کچھ سیکرٹری کی لاپرواہی سے ہوا تھا۔ لیکن لوول ٹامس نے اسے کچھ نہ کہا۔ جب وہ معافی مانگنے لگی۔ تو لوول ٹامس نے اسے یہ واقعہ بھول جانے کے لئے کہا۔ لوول ٹامس کا مزاج کبھی برہم نہیں ہوا۔ اور نہ ہی کبھی غصے میں آکر اس نے اونچا بولنے کی کوشش کی ہے وہ انسانی تعلقات کے فن میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

کئی برس پہلے جب اس نے بوسٹن میں مصور تقریروں کا ایک سلسلہ جاری کر رکھا تھا تو اس کے مشتعل قرض خواہوں کا ایک گروہ اس کے گھر آدھمکا۔ اس زمانے میں اس کی مالی حالت بے حد پتلی تھی۔ اگرچہ اس نے بیس سے تیس برس کی عمر میں 200'000 دو لاکھ پونڈ کمائے تھے۔ لیکن بعض کاروبار میں نقصان کے سبب یہ ساری دولت اس کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ یہ قرض خواہ اور ان کے وکیل اس کے کیمرے، فلموں اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں پر قبضہ جمانے آئے تھے۔ ٹامس نے ان کا یوں استقبال کیا۔ جیسے وہ اس کے معزز مہمان ہوں۔ ان کی خوب آؤ بھگت کی اور بعد میں بڑے پرخلوص لہجے میں بتایا کہ وہ لوگ اس کا کیمرہ وغیرہ نہ لے جائیں۔ کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ ان کا قرض اتار سکتا تھا۔ اور اس کے کام میں دخل انداز نہ ہوں۔ قرض خواہ بڑے مشتعل ہو کر آئے تھے۔ لیکن جاتی دفعہ وہ خود کو لوول ٹامس کا گہرا دوست محسوس کر رہے تھے۔ بعد میں اس نے ان کی ایک ایک پائی ادا کر دی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کیپٹن ایڈورڈ ایلس برگ

وہ ہر ناممکن کام کو ممکن کر دکھاتا ہے۔

کیپٹن ایڈورڈ ایلس برگ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بحری فوج کا ایک ایسا افسر ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت ناممکن کام کو ممکن کر دکھانا ہے کئی برس سے کیپٹن ایلس برگ ایسے کام کر رہا ہے۔ جو متعلقہ ماہرین کی نظروں میں ناممکن تھے میں اس بات کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔

1926ء میں روڈے آئی لینڈ کے قریب 132 فٹ گہرے پانی میں آبدوز کشتی ایس-51 ڈوب گئی۔ کھلے سمندر میں اس قدر گہرائی سے اس وقت سے پہلے کوئی ڈوبی ہوئی آبدوز کشتی نہ نکالی گئی تھی۔ ماہرین فن بھی یہ بات ناممکن قرار دیتے تھے۔ لیکن کیپٹن ایلس برگ نے اسے ممکن کر دکھایا۔

جب 1914ء میں ایڈورڈ ایلس برگ نے امریکہ کی نیوی اکیڈمی سے سند حاصل کی تھی تو اس سے پہلے کسی جہاز راں نے جہاز رانی کے فن میں مکمل مہارت پیدا نہ کی تھی۔ اس فن کے ماہرین کا خیال تھا کہ کوئی شخص جہاز رانی کے فن پر مکمل دسترس حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن کیپٹن ایڈورڈ ایلس برگ نے ان کا دعویٰ باطل کر دیا۔

جب امریکہ کی نیوی نے کیپٹن ایلس برگ کو بحیرہ زرد میں ماساوا کے مقام پر اطالویوں کے بحری اڈے میں غرق شدہ دو خشک ڈیک اور ایک امدادی جہاز نکالنے کے لئے کہا تو ماہرین فن یہ کام ناممکن سمجھتے تھے۔ ایڈمرل ہیرلڈ' آرسٹارک' یورپ میں امریکی بحری فوج کا کمانڈر اس واقعہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

ماساوا میں کیپٹن ایلس برگ نے نہایت مہارت اور مستعدی کا مظاہرہ کر کے دو ڈوبے ہوئے خشک ڈیک سمندر سے نکال دیئے۔ حالانکہ ماہرین فن کی یہ اکثریت یہ کام ناممکن قرار دے چکی تھی۔

یہ غیر معمولی معرکہ سر کرنے پر امریکی نیوی نے اسے "لیجن آف میرٹ" نامی

امتیازی تمغہ عطا کیا تھا۔ بہت سے اخباروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ کیپٹن ایلس برگ کے اسی معرکے کی بدولت اتحادی بحیرہ روم میں جنگ جیتنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

یہ واقعہ 1942ء کے موسم بہار کا ہے۔ پرل ہاربر پر جاپانی بمباری کے چھ ماہ بعد وہ اتحادیوں کے لئے جنگ کا بڑا صبر آزما اور مایوس کن دور تھا۔ جرمنی فوج جنرل رومیل کی قیادت میں نہر سویز سے فقط دو سو میل دور رہ گئی تھی۔ اور وہ سکندریہ میں سب سے بڑے برطانوی بحری اڈے پر بمباری کر رہی تھی۔ برطانیہ جانتا تھا کہ اگر جرمنوں کو نہر سویز پر قبضہ کرنے سے نہ روکا گیا تو اتحادی جنگ ہار جائیں گے۔

برطانوی جنگی جہاز بحیرہ روم کے مشرق میں پڑے تھے اور مرمت طلب تھے اس سبب سے ان کی رفتار بھی نصف رہ گئی تھی۔ لیکن سب سے قریبی خشک ڈیک بھی چار ہزار میل دور جنوبی افریقہ میں تھا۔ یہ فاصلہ نیویارک اور لندن کے درمیانی فاصلے سے بھی زیادہ تھا۔

لیکن قاہرہ سے نو سو میل دور بحیرہ زرد میں اتحادیوں نے ماساوا کے بحری اڈے پر ان دنوں ہی قبضہ کر لیا تھا۔ ایک زمانے میں وہاں جہازوں کی مرمت کے لئے دو بہترین خشک ڈیک ہوا کرتے تھے۔ لیکن اطالویوں نے وہ بحری مرمت گاہ چھوڑنے سے پہلے قسم کھائی کہ اگر وہ اسے استعمال میں نہیں لا سکے تو کوئی دوسرا بھی اسے استعمال نہ کر سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسے مکمل تباہ کر دیا اور خشک ڈیک ڈبو دیئے۔

برطانیہ جانتا تھا کہ اگر ماساوا کی بحری مرمت گاہ دوبارہ ٹھیک ہو جائے تو اس کا مطلب بحیرہ روم میں جنگ جیت لینا ہو گا۔

لیکن یہ کام وہ کیسے کر سکتے تھے؟ اس کے لئے آدمیوں اور سامان کی ضرورت تھی اور اس وقت ان کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں۔ انہوں نے امریکہ سے مدد کی درخواست کی۔ اس درخواست پر کیپٹن ایلس برگ کو وہاں بھیجا گیا۔

بعض ماہرین فن ڈوبے ہوئے خشک ڈیک کو سمندر میں سے نکالنا عملی دائرے سے باہر خیال کرتے تھے اور کہتے تھے اگر انہیں نکال بھی لیا گیا تو انہیں خشک کرنے اور ان کے سوراخوں کی مرمت میں کئی سال صرف ہو جائیں گے لیکن کیپٹن ایلس برگ نے فقط تیرہ آدمیوں کی مدد سے نو دن کے اندر اندر خشک ڈیک سمندر کی گہرائی سے نکال دیئے۔

آپ کو یہ بات ناقابل یقین محسوس ہوئی ہو گی؟ حقیقت بھی یہی ہے اور وہ بھی ایسے کڑے حالات میں جن میں انہیں کام کرنا پڑا تھا۔

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

اول تو ان کے پاس آلات کی کمی تھی۔ شکست خوردہ اطالوی فوج نہ صرف مشین تباہ کر گئی تھی۔ بلکہ تمام ہتھیار وغیرہ بھی ساتھ لے گئی تھی۔ کیپٹن ایلس برگ نے مجھے بتایا۔ ہم آلات کے اس قدر حاجت مند تھے کہ جب کوئی جہاز بندرگاہ میں آتا تو ہم اس کے کیپٹن سے ہتھوڑوں اور پیچ کس وغیرہ کی درخواست کرتے ایک دفعہ ایلس برگ کو فقط ایک آدمی کی خاطر اسی میل کا سفر کرنا پڑا۔

ایلس برگ نے دیکھا کہ اطالویوں نے پسپائی سے پہلے جہاز مرمت کرنے والی مشینوں کو بالکل تباہ نہ کیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ ان کے مختلف صحیح پرزے نکال کر ان سے نئی مشینیں بنا لی جائیں اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے ایک بھٹی تیار کی اور وہ ٹوٹے ہوئے پرزوں کو نکال کر ان کی جگہ دوسری مشینوں کے صحیح پرزے ڈالنے لگے۔ اس طرح دو ماہ کے اندر اندر اس نے تمام مشینیں کام کرنے کے قابل بنا لیں۔

کیپٹن ایلس برگ کے راستے میں دوسری بڑی رکاوٹ بے پناہ گرمی تھی۔ بحیرہ زرد دنیا کے تمام سمندروں سے زیادہ گرم ہے۔ ماساوا میں سمندر کا پانی اس قدر گرم ہو جاتا کہ وہ لوگ خود کو ٹھنڈا کرنے کے لئے غسل بھی نہ کر سکتے تھے جہازوں کا لوہا بعض اوقات 160 ڈگری تک گرم ہو جاتا تھا۔ ہتھیار دھوپ میں پڑے پڑے اس قدر گرم ہو جاتے کہ دستانے پہن کر انہیں اٹھایا جاتا۔ اور پھر پانی میں ٹھنڈا کر کے استعمال کئے جاتے۔

ماساوا میں خشک ڈیک کی دوبارہ تعمیر کے چھ ماہ کے اندر اندر کیپٹن ایلس برگ نے تین بہترین برطانوی جنگی جہاز مرمت کر دیئے اور اس سال نومبر میں جنرل رومیل کے خلاف حملے کی تیاریوں کے وقت تک وہ اسی مزید جہازوں کو ان کی اصلی حالت پر لے آیا۔ کیپٹن ایلس برگ اور اس کے آدمیوں نے ماساوا میں اپنے حیرت ناک کام کے سبب جنرل مونٹ گمری کو رومیل کے خلاف اپنے عظیم حملے میں مدد دی۔ رومیل کے خلاف یہی حملہ دوسری جنگ عظیم کا فیصلہ کن ثابت ہوا۔

ایلس برگ نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ جب ایک دن وہ 1927ء میں ڈوبی ہوئی آبدوز کشتی ایس۔ 4 کو دیکھنے کے لئے سمندر میں اترا تو موت نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایس۔ 4 ایک ساحلی حفاظتی جہاز سے ٹکرا کر ماساچوسٹس کے نزدیک 110 فٹ گہرے پانی میں غرق ہو گئی تھی۔ اس آبدوز کشتی میں چالیس آدمی تھے۔ اس حادثے کی خبر نے امریکی عوام کو چوکنا کر دیا۔ اگرچہ اس زمانے میں ایلس برگ نیوی میں نہ تھا۔ لیکن وہ گہرے پانی میں

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

غوطہ لگانے کے سلسلے میں ایک اتھارٹی تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی خدمات پیش کیں اور اسے جائے حادثہ پر پہنچا دیا گیا۔ تین دن تک سمندر ایک ایسے طوفان کی زد میں رہا۔ جس کے سبب غوطہ خور گہرے پانی میں اتر نہ سکے۔ جب طوفان تھما تو اس وقت تک کشتی کے اندر مقید چالیس آدمی مر چکے تھے۔ بہرحال ایلس برگ یہ دیکھنے کے لئے سمندر میں اتر گیا کہ کیا آبدوز کشتی کو دو حصوں میں تقسیم کئے بغیر سمندر کی تہ سے نکالا جا سکتا ہے؟

آبدوز کشتی کا معائنہ کرتے وقت ایلس برگ کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ صحیح سمت کھو چکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ڈوبی ہوئی آبدوز کشتی کے اوپر کھڑا ہے لیکن کیچڑ کے ایک بادل نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اسے بذات خود آبدوز کشتی کا کوئی حصہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ غلط سمت میں ایک قدم اسے موت سے ہم آغوش کر سکتا تھا۔ یہ واقعہ اس کی اپنی زبان سے سنیں۔

میں ایک دم ٹھہر گیا۔ اس نے کہا "میں اس بات سے ڈرتا تھا کہ غلط سمت میں ایک قدم مجھے آبدوز کشتی سے نیچے پھینک دے گا۔ میرے حواس گم ہو چکے تھے۔ میں وہاں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر "فالکن" جس جہاز سے میری لائف بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اچانک لہروں پر ایک ہچکولا کھایا اور میرے رسے میں تناؤ آ گیا۔ میرا توازن بگڑ گیا اور میں آبدوز کشتی کے پہلو میں جا گرا۔

"میں اس لئے خوف زدہ تھا کہ میں نے ہوا والی نالی سے تقریباً رشتہ منقطع کر لیا تھا اور ہوا جلد جلد خارج ہو رہی تھی۔ جوں جوں ہوا ختم ہو رہی تھی میں خود پر سمندر کا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اب میں بمشکل سانس لے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر میں میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ میں نے سمندر کی تہہ کا کھوج لگانے کے لئے پاؤں مارا۔ جو مزید کیچڑ میں اترتا چلا گیا۔ اب میں مکمل اندھیرے میں تھا اور شکستہ آبدوز کشتی کے پیندے پر کھڑا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ اگر میں نے حرکت کی تو لوہے کے ٹکڑے میرے غوطہ خور سوٹ کو پھاڑ دیں گے اور اس کا مطلب ایک دم موت تھا۔

پھر مجھے ایک مسلسل سرگوشی کا احساس ہوا۔ ہوا اب تک ایک نالی کے ذریعے سے مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے یہ نالی مزید کشادہ کر دی اور میرا سارا سوٹ ہوا سے بھر گیا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی دیو نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر کیچڑ سے نکال لیا ہو۔ میں تیرتا ہوا۔ سمندر کی سطح پر آ گیا۔ اس طرح ایک ناقابل یقین انداز میں میری زندگی بچ گئی۔

امریکہ کے عظیم ترین بحری فوج کے ہیرو کیپٹن جون پال جونیئر کی زندگی میں جون برگ اس قدر دلچسپی لیتا تھا کہ اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا اس نے پڑھ ڈالا۔ آخر ایلس برگ نے خود جون پال جونیئر کے متعلق ایک کتاب لکھی اس نے مجھے بتایا کہ وہ جون پال جونیئر کی زندگی سے بے حد متاثر ہے یہ شخص جو بارہ سال کی عمر میں ایک جہاز ران اور ستائیس برس کی عمر میں کیپٹن بن گیا تھا۔ جون پول جونیئر کی قوت مقابلہ نے ایلس برگ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے وہ قوت مقابلہ جس کا مظاہرہ جون پال جونیئر نے اس وقت کیا جب دشمن نے اسے ہتھیار ڈالنے کے لئے کہا تھا "ہتھیار ڈال دوں؟" جون پال نے دشمن کو کیا جواب دیا۔ "ابھی تو میں نے لڑنا شروع کیا ہے۔" یہ الفاظ ایلس برگ کی زندگی کا نصب العین بن گئے تھے۔ کیونکہ جب کوئی اس سے کہتا۔ "میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" تو ایڈورڈ ایلس برگ آگے بڑھتا اور اسے بڑی خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیتا۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ارونگ برلن

امریکہ کا مشہور ترین گیت نویس کسی زمانے میں گھٹیا اور سستے ہوٹلوں میں گایا کرتا تھا۔

امریکہ کے 1929ء کے مالی بحران میں فقط ایک شخص اپنی پائی پائی کھو چکنے کے باوجود خوش تھا۔ ایک سال وہ لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ مگر دوسرے برس اس کی مالی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ اس نے ایک شو کی نمائش کے لئے دو ہزار پونڈ قرض لئے۔ حال ہی میں اس کی بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ 1929ء کے مالی بحران میں اپنی غیر حالت پر اب خوش ہے۔ کیونکہ اس بہانے وہ پھر سے اپنا پسندیدہ کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ گیت لکھنے کا کام وہ شخص ارونگ برلن ہے۔ 1929ء کے بعد اس نے جو پہلا منظوم کھیل لکھا اس کا نام "ہزاروں تالیاں" تھا۔

1929ء میں ارونگ برلن کے پاس بے حساب دولت تھی اور اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں یہ منصوبہ بنا رکھا تھا کہ وہ باقی عمر ملک ملک گھوم پھر کر گزار دے گا۔ اس زندگی میں اسے مزہ ملتا تھا۔ لیکن اب اسے احساس ہو گیا ہے کہ آوارگی کے بجائے دوبارہ گیت میں زیادہ لطف ملتا ہے۔

1930ء میں وہ اس بات پر متفکر تھا کہ کیا وہ پھر سے ایک گیت نویس کی حیثیت سے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے گا۔ وہ گزشتہ اٹھارہ برس سے مقبول عام گیت لکھ رہا تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔

لیکن ارونگ برلن دوبارہ گیت لکھنے پر مجبور تھا۔ لہٰذا اس نے "ہزاروں تالیاں" لکھا۔ یہ بے حد مقبول ہوا۔ اس میں خود اعتمادی بڑھ گئی۔ ہالی وڈ والوں نے اسے ایک نیا غنائیہ لکھنے کو کہا۔ اس کا نام "ٹاپ ہیٹ" تھا ہالی وڈ والے اسے اس غنائیہ کا معاوضہ یک مشت دینا چاہتے تھے لیکن وہ منافع میں ایک مخصوص شرح لینے پر مصر رہا۔ اس طرح اس فلم میں اس نے پانچ گیت لکھ کر 70'000 پونڈ کمائے۔

اس کے بعد اس نے کیے بعد دیگرے بیسیوں مقبول عام گیت لکھے ہیں۔ مثلاً "ایسٹر پریڈ اور وائٹ کرسمس" جیسے گیت۔ 1942ء میں اس نے اپنی زندگی کا بہترین منظوم ڈرامہ لکھا۔ اس ڈرامے کا نام "یہ فوج ہے۔" تھا۔ یہ ڈرامہ اس نے کسی قسم کے معاوضے کے بغیر لکھا۔ اس کھیل سے اس نے 2500'000 پونڈ کمائے۔ لیکن اس نے یہ ساری رقم آرمی ایمرجنسی ریلیف فنڈ میں دے دی۔

اگرچہ ارونگ برلن دنیا کا مشہور ترین مقبول عام گیت لکھنے والا ہے لیکن یہ حیرت ناک بات ہے کہ وہ موسیقی کے فنی پہلوؤں سے بہت کم واقفیت رکھتا ہے اور جو طرزیں اس کی دل کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہیں انہیں وہ موسیقی کی زبان لکھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ وہ طرز کو گنگناتا ہے اور اس کا ملازم جو ایک موسیقار ہے وہ طرز لکھ لیتا ہے۔

ارونگ برلن نے اپنی زندگی میں کبھی موسیقی کا ایک سبق بھی نہیں لیا اس کے باوجود وہ امریکہ کی عام فہم موسیقی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے امریکہ کا سنجیدہ موسیقار جون ایڈلس کارپینٹر لکھتا ہے "اس بات پر میرا یقین ہے کہ آئندہ صدی کے موسیقی کے مورخ اور نقاد امریکی موسیقی اور ارونگ برلن کے یوم پیدائش کو ایک ہی پائیں گے۔"

ارونگ برلن موسیقی پڑھ بھی نہیں سکتا اس کے باوجود اس نے موجودہ گیت کاروں میں سب سے زیادہ گیت لکھے ہیں۔ اس کے گیتوں کی تعداد آٹھ سو سے اوپر ہے۔ اس کے ناکام گیتوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے مگر ایسے گیت اس کے کامیاب گیتوں میں دب گئے ہیں۔

وہ فقط دو برس سکول گیا۔ میرے خیال میں اس نے جو پہلی کتاب شروع سے آخر تک پڑھی ہے۔ وہ اس کی اپنی سوانح حیات ہے۔ نامور لوگوں کی سوانح عمریاں یا تو ان کے بڑھاپے میں یا ان کی موت کے بعد لکھی جاتی ہیں لیکن ارونگ برلن کی سوانح حیات اس وقت لکھی گئی جب وہ فقط 35 برس کا تھا۔

ارونگ برلن کو اپنے پہلے گیت کا معاوضہ فقط ایک شلنگ ملا لیکن تین برس بعد اس نے ایک ایسا گیت تخلیق کیا۔ جس نے امریکی موسیقی کا رخ بدل دیا اور جس سے اس نے 40'000 پونڈ کمائے۔ اس گیت کا نام "الیگزینڈرز ریگ ٹائم بینڈ" ہے۔ یہ اپنے زمانے کا سب سے مشہور گیت ثابت ہوا لیکن اس گیت کی اشاعت سے پہلے براڈوے کے ایک مشہور ڈائریکٹر نے اسے اپنے ایک کھیل میں لینے سے انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ عوام میں مقبول نہ ہو گا۔ لیکن جارج ایم کوہان جانتا تھا کہ عوام کی پسند کیا ہے۔ اس نے یہ گیت لے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کر 1911ء میں اپنے کھیل میں استعمال کیا اور ساری امریکی قوم اس کی دھن پر رقص کرنے لگی۔

ستائش موسیقی کی قومی کمیٹی نے 1940ء میں ارونگ برلن کو بہترین کمپوزر کی حیثیت سے انعام دیا۔ یہ اعزاز اسے "خدا امریکہ پر رحمت کرے" کی تخلیق پر دیا گیا تھا۔ یہ گیت ثانی قومی ترانہ بن گیا ہے۔

"خدا امریکہ پر رحمت کرے" پہلی جنگ عظیم کے دوران میں لکھا گیا تھا لیکن یہ 1939ء سے پہلے شائع نہ ہو سکا۔ یہ موونچ کے بحران کے بعد شائع ہوا تھا۔ کیونکہ ارونگ برلن کو خدشہ تھا کہ ایک دوسری جنگ عظیم دنیا کو تباہ کرنے پر آمادہ ہے۔ امریکیوں کے دل متحرک کرنے کے لئے ایک گیت کی ضرورت تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں محب الوطنی کی آڑ لے کر اس پر روپیہ کمانے کا الزام نہ لگایا جائے۔ لہٰذا اس نے اس گیت کی ساری رائلٹی گول گائیڈ اور بوائے سکاؤٹ کو دے دی۔

"خدا امریکہ پر رحمت کرے" یہ الفاظ اس نے پہلی مرتبہ اپنی والدہ کی زبان سے سنے تھے۔ اس خاتون نے یہ الفاظ دل کی گہرائیوں سے روسی زبان میں کہے تھے۔ اس کے نزدیک امریکہ کی سلامتی اور آزادی کے لئے دعائیں مانگنے کا جواز تھا۔ اسے ان کے شوہر اور ان کے چھ بچوں کو زبردستی روس سے نکال دیا گیا تھا۔ ارونگ برلن کو روس میں اپنے گھر کی فقط یہی بات یاد ہے کہ اس نے رات کی تاریکی میں اپنے گھر سے شعلے اٹھتے دیکھے تھے۔

ارونگ برلن کا کنبہ 1892ء میں بحری جہاز کے ذریعے امریکہ آیا جہاز میں لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ارونگ برلن کے ماتھے پر آج بھی اس چاقو کا نشان موجود ہے۔ جو جہاز میں اس سے اوپر والی سیٹ پر سوئے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے گر کر اس کی پیشانی پر لگا تھا۔

جب یہ بے سر و سامان کنبہ نیویارک پہنچا تو ارونگ برلن کی چاروں بہنیں گزر اوقات کے لئے کشیدہ کاری اور اس کا بڑا بھائی ایک درزی کی دکان میں کام کرنے لگا۔ باپ کو کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا کام مل جاتا یہ کنبہ پہلے تو ایک تنگ و تار کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ مگر بعد میں وہاں سے منتقل ہو کر نیویارک کے نچلے طبقے کی آبادی میں دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ میں چلا گیا۔ روس میں آگ اور خون کے جس جہنم سے گزر کر وہ لوگ آئے تھے اس کے مقابلے میں یہ زندگی جنت نشان سے کم نہ تھی۔ خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے اس کی والدہ کی

زبان پر بار بار یہ الفاظ آتے "خدا امریکہ پر رحم کرے۔ خدا امریکہ پر رحم کرے۔"

اروِنگ برلن نے ایک دفعہ خود کہا تھا۔ "آپ تجربات کے بغیر گیت نہیں لکھ سکتے۔ جس چیز کے بارے میں آپ کچھ لکھنا چاہیں وہ آپ کی رگ رگ میں رچی ہوئی چاہیے۔ "خدا امریکہ پر رحمت کرے" اسے لکھنا نہ پڑا تھا۔ بلکہ خود بخود اس کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ پڑا تھا۔

اروِنگ برلن کے بہت سے گیت اس کی اپنی زندگی کی عکاسی ہیں۔ جب 1911ء میں اس کی پہلی بیوی فوت ہوئی (شادی کے فقط چھ ماہ بعد) تو اس نے یہ گیت لکھا "جب میں تمہیں کھو چکا۔" 1917ء میں جب جنگ کے دوران میں وہ سپاہی تھا اور اسے صبح چھ بجے اٹھ کر پریڈ کرنی پڑتی۔ تو بہت شور مچایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے یہ گیت لکھا "اوہ صبح اٹھنے سے مجھے کس قدر نفرت ہے۔" جب خوبصورت ایلن میکے کو اروِنگ برلن سے محبت ہو گئی۔ اور دونوں کا معاشقہ ختم کرنے کے لئے ایلن میکے کے والد نے غصے میں آ کر اپنی بیٹی کو یورپ بھیج دیا۔ تو اس حادثے کی یاد میں اروِنگ برلن نے یہ گیت لکھے "تن تنہا" اور "مجھے یاد رکھنا" دونوں کی شادی سے چند روز قبل اس نے اپنے جذبات اس گیت میں ڈھالے "میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔"

مسز برلن نے مجھے ایک طلائی سگریٹ کیس دکھایا جو اس کے شوہر نے اسے سالگرہ پر تحفہ دیا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر مصرع کندہ تھا۔ "میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔" گزشتہ بیس برس سے جب ان کی شادی ہوئی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں وہ دونوں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں۔

اروِنگ برلن اور ایلن میکے کی شادی نے امریکہ کے معاشرے میں ایک سنسنی پیدا کر دی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا کیونکہ وہ دونوں متضاد معاشرتی طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایلن میکے کا والد نیویارک کے معاشرے کا لیڈر تھا۔ اس کی پرورش عیش و عشرت اور محلات میں ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اروِنگ برلن ابتدا میں گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں گیت گاتا اور سامعین اسے جو پیسے دیتے ان پر گزر اوقات کرتا رہا تھا۔

لیکن ہر قسم کی مخالفت کے باوجود ان کی شادی بہت کامیاب رہی ہے اس نے مصنوعی اور کھوکھلی معاشرتی قدریں منہدم کر دی ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں ہیں اور وہ موسم گرما کیٹس کل ماؤنٹین میں اپنے فارم پر بسر کرتے ہیں۔ وہ دونوں شبینہ کلبوں کے بالکل شوقین نہیں۔

ان کا کام ان کی زندگی ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' ارونگ برلن نے زندگی میں ایک بھی موسیقی کا سبق نہیں لیا۔ لیکن اس نے زندگی کے ابتدائی دور میں ایک ایسی بات سیکھ لی تھی۔ جو موسیقی کی کلاسوں میں ہرگز سکھائی نہیں جاتی اس نے ایسے گیت لکھنے اور ان کی دھنیں مرتب کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ جنہیں عوام پسند کریں۔ ایک زمانے میں وہ ایک نابینا موسیقار کو نیویارک کے مشرقی حصے میں لے کر گھوما کرتا تھا۔ وہ موسیقار کلبوں میں گیت گاتا تھا اور لوگ اسے پیسے دیتے تھے۔ گیت لکھنے اور ان کی دھنیں مرتب کرنے کا فن ارونگ برلن نے اس نابینا موسیقار سے سیکھا تھا۔ پھر ایک زمانے میں وہ خود بھی سستے قسم کے تھیٹروں اور عام تماشہ گاہوں میں گانے لگا۔

بہت کم لوگوں کی زندگیوں میں تجربوں کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے اور ان تجربوں کی بدولت بہت کم لوگ اتنے خوبصورت گیت لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

○

kutubistan.blogspot.com

جنرل ڈگلس میکارتھر

اس نے امریکہ کا سب سے بڑا فوجی اعزاز حاصل کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

امریکہ کی فوجی تاریخ میں فقط ایک ایسا جنرل ہے۔ جس پر تیر و کمان کے حملوں کے علاوہ بمبار ہوائی جہازوں کے حملے بھی ہوئے۔ آپ کے خیال میں وہ جنرل کون ہو سکتا ہے؟

شاید آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں۔ میں جنرل ڈگلس میکارتھر کا ذکر کر رہا ہوں۔ جنرل میکارتھر نے انڈین تیروں کی سنسناہٹ کے علاوہ جاپانی بمبار طیاروں کی گرج بھی سنی ہے۔

خانہ جنگی کے اختتام پر جنرل میکارتھر کا والد جو باقاعدہ فوج میں کرنل تھا اس کا تقرر ایک ایسے علاقے میں ہوا جو اب نیو میکسیکو کا ایک حصہ ہے۔ وہ بڑے بدامنی اور لاقانونیت کے دن تھے۔ جنرل میکارتھر کے والد کو وہاں امن بحال کرنے اور لاقانونیت ختم کرنے کی غرض کے لئے بھیجا گیا تھا۔

1884ء کے ایک دن ریڈ انڈینوں نے اس عمارت پر حملہ کر دیا جسے امریکی فوج بطور قلعہ استعمال کرتی تھی۔ اس زمانے میں میکارتھر فقط چار برس کا تھا۔ وہ اپنے انڈین ملازم کی نگرانی میں بھاگ کر باہر چلا آیا۔ یہاں ایک تیر اس کے سر سے فقط دو انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔

جنرل میکارتھر کو اپنی ابتدائی یادداشتوں میں بگل کی آواز کے سوا اور کوئی بات یاد نہیں۔ وہ گنوں کی آوازیں اور سپاہیوں سے گیٹس برگ اور مشنیری برج پر حملے کے قصے سنا کرتا۔ نوجوان ڈگلس میکارتھر اکثر اس اعزازی تمغے کو بڑی بڑی دیر گھورتا رہتا جو خانہ جنگی کے اختتام پر اس کے والد کو اس کی خدمات کے عوض دیا گیا تھا۔ اس تمغے کا نام کانگریشنل میڈل آف آنرز تھا۔ امریکہ میں جو سب سے بڑا فوجی اعزاز۔ جنرل ڈگلس میکارتھر نے قسم کھائی کہ وہ بھی ایک دن یہی اعزاز حاصل کر کے رہے گا۔ اور اس نے ایسا کر دکھایا۔ نصف صدی

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بعد باٹان اور کوریجی ڈور کے مقامات پر اپنی ثابت قدمی کے عوض اسے یہ تمغہ دیا گیا۔ باٹان میں اس کی فوجوں کے مقابلے میں دشمن کی فوجیں دس گنا زیادہ تھیں۔ سمندر اور ہوا پر جاپانیوں کا تسلط تھا۔ اس کے باوجود میکارتھر نے باٹان میں خون سے امریکی تاریخ کے چند ولولہ انگیز اور موثر صفحات لکھے ہیں۔

جنرل میکارتھر کسی کی پشت پر نکتہ چینی کرنے والا شخص نہیں۔ اس کے دوست اس کے خلوص کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم اسے اس کے پہلے نام سے بلاتے ہیں۔ اس کی بیوی بھی اسے جنرل کہہ کر بلاتی ہے۔

کرنل ایلن پوپ جو ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں جنرل میکارتھر کا روم میٹ تھا۔ وہ جنرل میکارتھر کو بخوبی سمجھتا ہے اس نے مجھے بتایا کہ میکارتھر وضع دار انسان ہے۔ پرانے مکتب خیال کا انسان۔ وہ رنگین اور مرصع زبان اور ڈرامائی انداز میں گفتگو کرنے کا شوقین ہے۔ وہ ہر لفظ صاف صاف بولتا ہے۔

جنرل میکارتھر ایک عظیم سپاہی ہے۔ اس کے باوجود وہ بڑا جذباتی ہے۔ جب وہ ویسٹ پوائنٹ میں کیڈٹ تھے تو ایک دن "دی میوزک ماسٹر" نامی کھیل دیکھنے گئے۔ اس کھیل نے میکارتھر پر اتنا اثر کیا کہ وہ رونے لگا۔

جب میکارتھر فلپائن گیا تو وہاں کی گرمی اور بیزاری نے اسے ترغیب دی کہ وہ بھی دوسرے افسروں کی طرح شراب نوشی اور تعیش کی آرام دہ زندگی میں پڑ جائے۔ جب کبھی اس کے دل میں کوئی اس قسم کا خیال آتا۔ تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود کو سمجھاتا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض یاد دلاتا۔

جنرل میکارتھر نے ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی سے دوسرے تمام طلباء سے زیادہ نمبر حاصل کر کے امتحان پاس کیا۔ وہ اپنی کلاس میں اول آیا اس کے ہم جماعتوں کا خیال تھا کہ قسمت نے اسے ایک راہنما بنانے کے لئے چن رکھا ہے۔ میں آپ کے سامنے اس کا ریکارڈ پڑھے دیتا ہوں۔

جنرل میکارتھر کو جب میجر جنرل بنایا گیا۔ تو وہ سب سے کم عمر جنرل تھا وہ پہلا امریکی ہے۔ جسے دو دفعہ "چار ستاروں والا" جنرل بنایا گیا۔ وہ ویسٹ پوائنٹ کا سب سے کم عمر سپرنٹنڈنٹ تھا۔

جنرل میکارتھر نے تمام امریکی سپاہیوں میں سب سے زیادہ تمغے حاصل کئے ہیں۔ اس

کے علاوہ دس دوسرے ملکوں نے اسے اعزازی امتیاز دیئے ہیں وہ پہلا امریکی افسر ہے جو فیلڈ مارشل بنا۔ یہ اعزاز اسے فلپائن کی حکومت نے دیا تھا۔ وہ پہلا جنرل ہے۔ جس نے اتحادی فوجوں کی بحری، بری اور ہوائی فوجوں کی مشترکہ کمان سنبھالی۔

گرانٹ کے بعد وہ پہلا سب سے کم عمر جنرل بنا اور موجودہ دور میں سب سے پہلے اسے کانگریشنل میڈل آف آنرز ملا۔ فلپائن کی حکومت کا فوجی مشیر ہونے کی حیثیت سے جس قدر تنخواہ اسے ملتی تھی۔ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں کسی فوجی مشیر نے اتنی تنخواہ نہیں لی۔ میکارتھر امریکی فوج کا سب سے کم عمر چیف آف سٹاف تھا۔ اور وہ پہلا جرمنی افسر ہے۔ جسے چار برس کے معاہدے کے بعد دوبارہ چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا۔

کیا امریکہ کی فوجی تاریخ میں کسی دوسرے افسر کا اتنا اچھا ریکارڈ ہے؟

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب امریکی فوجوں نے فرانس میں سینٹ مائمل پر حملہ کیا تو اس دن جنرل میکارتھر تیز بخار میں جل رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ آٹھویں فوج کو اس حملے میں ہدایات دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ وہ اس قدر کمزور تھا کہ اسے ڈر تھا کہ وہ محاذ جنگ پر چل پھر نہ سکے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے چار اردلیوں سے کہا کہ اگر اس میں چلنے کی سکت نہ ہوئی تو وہ اسے سٹریچر پر ڈال کر محاذ جنگ پر لے جائیں۔ جنرل ہگ جونسن جیسے کڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "میکارتھر وہ جنرل ہے۔ اگر اسے پتہ چل جائے کہ کہیں دوسری جگہ مرنے کا موقع مل سکتا ہے تو وہ بستر میں ہرگز آرام سے نہ مرے گا۔"

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں جب محاذ پر گولہ باری ہو رہی تھی تو میکارتھر اس آگ میں بلا خوف کود پڑا۔ لوگ اس کی اس جرات پر دنگ رہ گئے اور اس کی یہ بہادری فوج میں ضرب المثل بن گئی۔ جنگ کے دوران میں وہ دو دفعہ زخمی ہوا۔ مگر اسے جرات کے تیرہ تمغے ملے۔ اگر نیوٹن ڈی بیکر سیکرٹری جنگ نے 1918ء میں میکارتھر کو پہلی جنگ عظیم کا بہادر ترین جنرل کہا تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

جب اس زمانے میں میکارتھر اپنے آدمیوں کے ساتھ دشمنوں پر حملہ کیا کرتا تو اپنے پاس نہ تو کوئی ریوالور اور نہ ہی کوئی تلوار رکھتا اس کے ہاتھ میں فقط ایک چھڑی ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بہادری اس کے آدمیوں میں ولولہ انگیزی اور جرات پیدا کرے گی۔ اس کا نظریہ ہے کہ سپاہیوں میں بہادری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے جنرل کو بذات خود

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بہادری اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کرنا بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب منیلا پر جاپانی بمباری کر رہے تھے تو اس نے اپنے ہیڈ کوارٹرز سے امریکی جھنڈا اتارنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ جاپانیوں نے اس کے ہیڈ کوارٹرز کو اپنا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میکارتھر اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی فوجوں کو ضروری ہدایات اور تاریں جاری کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس نے جھنڈا اتار دیا وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو گیا تو اس کی فوجوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔

جنرل میکارتھر اکثر یہ کہا کرتا تھا۔ ”فقط انہیں لوگوں کو جینے کا حق ہے جو موت سے ہراساں نہیں ہوتے۔“

اپنے آدمیوں میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر کے انہیں میدان جنگ میں بھیجنے کی صلاحیت جنرل میکارتھر میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی قیادت میں لڑنے والے سپاہی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے ملک، گھر اور بیوی بچوں کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

کرنل کارلس رومولو ”میں نے فلپائن کا زوال دیکھا۔“ نامی کتاب کا مصنف ہے وہ باٹان اور کوریجی ڈور میں جنرل میکارتھر کا اے ڈی سی رہ چکا ہے تھوڑا عرصہ ہوا میں نے اس سے انٹرویو کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ باٹان کی لڑائی کے دوران میں جنرل میکارتھر نے اپنے سر پر آہنی ٹوپی پہننے سے انکار کر دیا اس نے اپنے ہر سپاہی کو یہ ٹوپی پہننے کا حکم دے رکھا تھا مگر خود ننگے سر میدان جنگ میں پھرتا رہا۔ جب ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے قریب سے گزر گئی۔ تو ایک سپاہی نے اس کے سر پر آہنی ٹوپی رکھنی چاہی۔ لیکن جنرل میکارتھر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ کرنل رومولو نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک دن باٹان میں جنرل میکارتھر اپنے باغ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک جاپانی بمبار طیارے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بمباری شروع کر دی۔ جنرل میکارتھر بڑے تحمل سے اٹھ کر ایک سائبان کی سمت چل پڑا۔ جب اس کے ایک دوست نے اسے جلدی جلدی قدم اٹھانے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا۔ کوئی جاپانی مجھے جلدی چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔

جب کرنل کارلس نے باٹان میں فلپائن سپاہیوں سے پوچھا کہ وہ کس کے لئے لڑ رہے ہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ جنرل میکارتھر اور اپنے شہنشاہ کے لئے۔ ان کے لئے میکارتھر ہی امریکہ ہے۔ امن کے زمانے میں ایک معمولی آدمی بھی جنرل میکارتھر کو مل سکتا ہے۔ ایک دفعہ ایک کسان جس کا بیٹا فوج میں اسے ملنے کے لئے آیا۔ جب وہ رخصت ہوا تو جنرل

میکارتھر اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔

فوج کا چیف آف سٹاف ہونے کی حیثیت سے جنرل میکارتھر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک نمایاں ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں دور اندیشی کی صلاحیت غیر معمولی حد تک ہے اس نے دوسری جنگ عظیم سے کتنا عرصہ پہلے ہی اس کی پیشن گوئی کر دی تھی اور کہا تھا کہ وہ پہلی جنگ عظیم سے بہت مختلف ہو گی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی جنگ ہو گی۔ اور اس میں رفتار نمایاں کردار انجام دے گی۔ وہ بار بار دنیا کو یاد دلاتا رہا کہ جاپانی اور جرمنی دنیا کو فتح کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

اگر امریکہ نے اس وقت میکارتھر کی بات غور سے سنی ہوتی' اور آئندہ جنگ کی تیاری کے لئے روپیہ دیا ہوتا تو جاپانیوں کو پرل ہاربر پر حملہ کرنے کی کبھی جرات نہ ہوتی۔ کیا جنرل میکارتھر کی ایسی پیش گوئیوں کا شکریہ ادا کیا گیا؟ ہرگز نہیں بلکہ انتشار پھیلانے کے الزام میں اس کی مذمت کی گئی۔

جنرل میکارتھر نے آسٹریلیا میں اپنے ہیڈ کوارٹر میں ذیل کی عبارت فریم کر کے اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھی ہے۔ یہ الفاظ ابراہام لنکن نے خانہ جنگی کے دوران میں اپنے ایک ایسے دوست کو لکھے تھے۔ جو اسے اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے نقادوں کو جواب دے۔

> "مجھ پر جس قدر حملے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کا جواب دینے بیٹھ جاؤں تو اپنا حقیقی کام کر چکا۔ مجھے معلوم ہے کہ میں اپنی سمجھ کے مطابق ٹھیک کام کر رہا ہوں۔ اور آخر تک یونہی کرتا رہوں گا۔ اگر انجام میں میرا کام صحیح نکلا تو میرے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہ ہو گی۔ لیکن اگر آخر میں میرا کام غلط نکلا تو دس فرشتے بھی قسم کھا کر کہیں کہ میں راستی ہوں تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ڈورتھی ڈکس

اس نے لاکھوں لڑکیوں کو شوہر منتخب کرنا سکھایا ہے۔

آپ کے خیال میں وہ کون سی خاتون ادیب ہے۔ جس کے مضامین دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ وہ امریکہ کی مشہور ترین خاتون ہے کیونکہ اس نے دنیا کے تمام ماہرین نفسیات کے مقابلے میں عام لوگوں کے نفسیاتی مسائل حل کرنے میں زیادہ مدد کی ہے۔ کئی برس سے وہ پریشان مردوں اور عورتوں سے ایک شفیق ماں جیسا سلوک کر رہی ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ کسی دوسرے شخص نے بہت سے گھرانوں کو تباہ ہونے سے نہیں بچایا۔ اس کی بدولت امریکہ میں طلاقوں کی رفتار بھی کم ہو گئی۔

اس عظیم خاتون کا نام مسز الزبتھ میری ویدر گلمر ہے۔ آپ نے یہ نام کبھی نہ سنا ہو گا۔ مگر آپ اس نام کی مالک خاتون سے واقف ضرور ہیں ڈورتھی ڈکس کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہو گا۔ بس یہی خاتون مسز گلمر ہے جب مسز گلمر نے 1896ء میں لکھنا شروع کیا تو اس نے اپنا یہی قلمی نام رکھا۔

"ڈورتھی" یہ نام اسے بے حد پسند تھا۔ ڈکس اس کے ایک ایسے ملازم کا نام تھا جو برسوں اس کے خاندان کا غلام رہا تھا' اس کی یاد میں اس نے یہ نام رکھ لیا۔ "ڈورتھی ڈکس کا نام تقریباً دو سو اخباروں میں شائع ہوتا ہے اور اس کے مضامین پڑھنے والے لندن سے آسٹریلیا اور نیویارک سے جنوبی امریکہ اور جنوبی افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

کچھ عرصہ پہلے ہو آرلینز میں مجھے ڈورتھی ڈکس کے ساتھ چائے پینے کا فخر حاصل ہو چکا ہے۔ اس نے مجھے اپنے بچپن اور اپنی ابتدائی تربیت سے متعلق بتایا کہ وہ کس طرح خانہ جنگی کے بعد والی دہائی میں اپنے والد کے گھوڑوں کے فارم پر رہا کرتی تھی یہ فارم ٹینس اور کنٹوکی سرحد پر واقع تھا۔ ڈورتھی ڈکس کا تعلق ایک معزز قدیم جنوبی خاندان سے ہے۔ جو خانہ جنگی میں اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ اس نے کہا "ہم مفلسی اور امارت کے عجیب و غریب ماحول میں رہا کرتے تھے۔ ہمارا گھر بڑا شاندار تھا۔ کھیتوں میں کپاس اور گندم کی بہتات'

مویشیوں اور بھیڑوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہمارے پاس تھی ہم مہاگنی کے میزوں پر چاندی کی طشتریوں میں کھانا کھاتے۔ اس کے باوجود ہمارے پاس ایک پیسہ نہ تھا۔

بچپن میں ڈورتھی ڈکس اس اون کے بنے ہوئے فراک پہنتیں جو ان کی اپنی بھیڑوں سے اتری ہوتی اس نے بتایا کہ اس کی ابتدائی نرس ایک گھوڑی تھی۔ ایک زمانے میں وہ گھوڑی ریس کورس کی شہزادی تھی مگر اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ لہٰذا اب اسے سارا دن مکان کے بے حد وسیع صحن میں گھاس چرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا "چلنے سے پہلے میں نے اس گھوڑی پر سوار ہونا سیکھا۔ ڈورتھی ڈکس نے کہا "میرا باپ مجھے اس گھوڑی کی پیٹھ پر بٹھا دیتا اور میں اس کی ایال پکڑ کر بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑی کسی درخت سے اپنا جسم رگڑتی تو میں نیچے گر پڑتی۔ میں اس وقت تک روتی رہتی جب تک کوئی مجھے دیکھ کر دوبارہ گھوڑی کی پشت پر نہ بٹھا دیتا۔"

ایک حبشی ملازمہ نے ڈورتھی ڈکس اور اس کے بہن بھائیوں کو آداب وغیرہ سکھائے۔ جب وہ کھانا کھانے میں مصروف ہوتے۔ تو وہ ایک نگران کی طرح ان کی کرسیوں کے پیچھے کھڑی رہتی۔ اگر وہ اچھے آداب سے انحراف کرتے۔ اگر وہ ایک دوسرے کی چیز چھینتے تو وہ ملازمہ انہیں گھورتی اور کہتی "کچھ تو ادب کا خیال کرو۔ بھوکوں جیسی حرکت کیوں کر رہے ہو؟"

ڈورتھی ڈکس اور اس کے بہن بھائیوں کو کھیلنے کے لئے خود ہی کھلونے بنانے پڑتے تھے اور وہ اپنی تفریحات بھی خود ہی ایجاد کرتے۔ ان کا بچپن بے حد اچھا تھا۔ اپنے بہن بھائیوں کے علاوہ اس کے بچپن کے ساتھی، گھوڑے اور کتے ہوتے تھے۔ ہم اپنے والد کے فارم پر ہوا کی طرح آزاد تھے۔" اس نے مجھے بتایا "کوئی ہمیں یہ نہ بتاتا تھا کہ ہم کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ہم گھوڑوں پر کاٹھی ڈال کر انہیں تیزی سے دوڑاتے ہوئے جنگل میں نکل جاتے۔ شکاری کتے ہمارے ساتھ ہوتے۔ ہم جانتے تھے کہ گلہریاں کہاں چھپی ہوتی ہیں اور عقاب کا آشیانہ کہاں ہے اور خرگوش اپنے بچے کہاں پالتے ہیں۔ ہم جنگل کے ایک ایک بھید سے واقف تھے اس زندگی نے ہمارے اندر بہت جلدی خود اعتمادی پیدا کر دی۔ ہمیں اپنے کام خود کرنے ہوتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی مشکل پیش آتی تو اس کا حل بھی ہمیں خود ہی تلاش کرنا ہوتا تھا۔ ہمیں خدا پر بھروسہ کرنا اور دروغ گوئی سے احتراز کرنا سکھایا گیا تھا۔

ڈورتھی ڈکس نے مجھے ایک عجیب بات بتائی اس نے اپنی زیادہ تر تعلیم ایک ایسے

بوڑھے شخص سے حاصل کی جو نیم پاگل تھی کسی زمانے میں وہ ڈورتھی ڈکس کے داوا کا بڑا گہرا دوست تھا۔ وہ ایک عرصے سے انہیں کے گھر میں رہتا چلا آ رہا تھا۔ اس بوڑھے شخص نے ڈورتھی کو فقط پڑھنا ہی نہ سکھایا۔ بلکہ کتابوں سے محبت کا جذبہ بھی اس میں پیدا کیا۔۔۔۔ ڈورتھی ڈکس کہنے لگی "بارہ برس کی عمر سے پہلے میں نے شیکسپئر' سکاٹ' ڈکنز کی تصنیفات ازبر کر لی تھیں اور سمولٹ' فیلڈنگ اور رچرڈسن کی بھی بہت سی تحریریں پڑھ ڈالی تھیں۔"

میرے والد کی لائبریری میں بچوں کی کوئی کتاب نہ تھی۔ لہٰذا مجھے اسی قسم کے خشک کاموں پر اپنے ذہنی دانت تیز کرنے پڑے۔ اس محنت کا پھل مجھے بعد میں ملا۔

ڈورتھی ڈکس بہت کم عرصہ سکول گئی۔ اس نے مجھے بتایا "میں مس ایلس کے سکول میں اس لئے نہ جاتی تھی کہ وہ سند یافتہ استانی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اس کا والد خانہ جنگی کے دوران میں گیٹس برگ میں لڑتا ہوا میدان جنگ میں کام آیا تھا اور اس کے کنبے کی پرورش کے لئے لوگوں کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔" ڈورتھی ڈکس ایک گلہری کی طرح درخت پر چڑھ جاتی اور یہ جاننے سے پہلے کہ سات ضرب سات انچاس ہوتے ہیں وہ ایک بہترین گھڑسوار بن چکی تھی۔

اپنے قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق اٹھارہ برس کی عمر میں ڈورتھی ڈکس کی شادی ہو گئی۔ اب اسے بھی ہزاروں دوسری لڑکیوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنا تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں ایک المیے نے اس کی گھریلو زندگی تباہ کر دی۔ اور اس کی مالی حالت بڑی خستہ ہو گئی اس کا شوہر ایک بیماری سے اپاہج ہو گیا اس حادثے کے پینتیس برس بعد وہ فوت ہوا۔ مگر یہ سارا طویل عرصہ ڈورتھی ڈکس اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر برداشت کرتی رہی۔ اولاً یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ کس طرح گھر چلانے کے لئے پیسے کمایا کرے گی۔ وہ اتنے بڑے ذہنی عذاب کا شکار رہنے لگی کہ بیمار ہو گئی اور اپنی صحت کی بحالی کے لئے اسے میسی سیپی کے ساحل پر جانا پڑا۔

اس واقعے نے اس کی زندگی بدل دی۔ وہاں اس نے سمندر کے کنارے فرصت کے اوقات میں ایک کہانی لکھی۔ اس کہانی کا مرکزی خیال ان کے اپنے ہی گھر کا ایک واقعہ تھا۔ جو خانہ جنگی کے دوران میں رونما ہوا تھا۔ ڈورتھی ڈکس کے والدین ڈرتے تھے کہ سپاہی ان کے گھر سے چاندی وغیرہ چرا کر لے جائیں گے۔ لہٰذا گھر کے ایک غلام نے ساری چاندی

ایک گنبد میں چھپا دی۔ غلام نے فقط چاندی ہی نہ چھپائی بلکہ اس گنبد میں رہنے والے بھوتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی نگرانی کریں اور چوروں کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ ڈورتھی ڈکس نے یہ کہانی اپنی ایک ہمسایہ عورت کے پاس فروخت کر دی۔ وہ خاتون نیو اورلینز میں ایک اخبار کی مالکہ تھی۔ اس نے ڈورتھی ڈکس کو اس کہانی کا معاوضہ بارہ شلنگ دیا اور ساتھ ہی اسے اپنے اخبار میں بحیثیت رپورٹر کے ملازم رکھ لیا۔ اس ملازمت سے اسے ایک پونڈ ہفتہ وار ملتا تھا اور اس ایک پونڈ پر وہ اور اس کا اپاہج شوہر گزر اوقات کرتے۔ اس پیشے نے ڈورتھی ڈکس کو ایک ایسے مستقبل کی راہ دکھا دی۔ جس میں اس کا نام گھر گھر مشہور ہو گیا اور اس کی ذات ایک امریکی ادارہ بن گئی۔

ڈورتھی ڈکس کے ابتدائی کاموں میں ایک کام ہر اتوار کو "سنڈے سلار" کے عنوان کے تحت خواتین کے لئے ایک مضمون لکھنا ہوتا تھا۔ اس مضمون میں وہ عورتوں کو اپنے گھریلو معاملات۔ بچوں کی نگہداشت اور شوہروں سے طرز سلوک کے متعلق مشورے دیتی وہ یہ ساری باتیں بڑی سادہ مگر پراثر زبان میں لکھتی۔ اس کے مضمون مکالموں کی شکل میں ہوتے اسی سبب عورتیں اسے پسند کرتیں۔

اس کے مضامین مقبول عام ہوتے گئے۔ ولیم اینڈ ولف ہرسٹ جو ہمیشہ نئے ہونہار لوگوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس نے ڈورتھی ڈکس کو زیادہ تنخواہ پر اپنے اخبار "ایوننگ جرنل" میں ملازمت پیش کی۔ اگرچہ ڈورتھی ڈکس کو روپے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن اس نے اپنے پہلے اخبار سے الگ ہونا پسند نہ کیا۔ کیونکہ اسی اخبار نے اس کی زندگی بنائی تھی۔ اور اسے کامیاب صحافیوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ اخبار چھوڑنے سے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن 1901ء میں جب اس اخبار کی مالکہ فوت ہو گئی تو وہ "ایوننگ جرنل" میں چلی آئی۔ اور اگلے بیس برس تک اس اخبار میں عورتوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنے کے علاوہ ان کے خطوں کا جواب بھی دیتی رہی۔

اس کے علاوہ وہ اپنے زمانے کی مشہور مقدموں کی رپورٹنگ بھی کرتی رہی۔ مثلاً ہیری کے' تھا کے قتل کا مقدمہ' نان پیٹرسن کا سنسنی خیز مقدمہ' رتھ سینڈر اور جد گرے کا مقدمہ وغیرہ۔

وہ ممتھی غیر شائستہ لڑکی جو بیس برس کی عمر تک چھ مرتبہ سے زیادہ گاڑی میں نہ بیٹھی تھی۔ جس نے بیس برس کی عمر سے پہلے کوئی تھیٹر نہ دیکھا تھا اور جو دو دفعہ سے زیادہ کسی

شہر میں نہ گئی تھی۔ وہی غیر شائستہ لڑکی نیویارک کی مشہور خاتون صحافی اور پسندیدہ زمانہ ادیبہ بن چکی تھی۔

ڈورتھی ڈکس سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ جن سوالوں کے جواب وہ دیتی ہے۔ کہیں خود ساختہ تو نہیں ہوتے اس کا جواب نفی میں ہے۔ اسے ہر روز سینکڑوں خط آتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ خط حیرتناک انسانی دستاویزیں ہیں۔ جن میں اس سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی اس کا کہنا ہے کہ ان خطوں سے اسے انسان کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع دیا ہے۔ اور اسے اس بات پر فخر ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے شخص کو یہ موقع ملا ہو۔ اس سے بڑے بڑے ناقابل یقین سوال پوچھے جاتے ہیں۔ مثلاً جمعہ کے روز بچے کی پیدائش مبارک یا منحوس ہوتی ہے۔ ہل مین کار میں کس طرح سونا چاہیئے۔ سخت ٹماٹر کس طرح کھانا چاہیئے۔ ذیل میں اس کے خطوں سے دو خاص اقتباس درج ہیں۔

”مس ڈکس! مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بہت زیادہ سفر کیا ہے آپ مہربانی کر کے مجھے یہ بتائیں کہ کیا فالتو بالوں کا کوئی علاج ہے؟“

”مس ڈکس! میں مردوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتی۔ میرا ناک متوسط اور ہونٹ بھرے بھرے ہیں۔ میں کالج کی تعلیم یافتہ ہوں۔“

ڈورتھی ڈکس کو ٹولین اور اوگلی تھورپ کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دے رکھی ہیں۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ جو القاب اسے سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے کہ اس کے دل میں اتر جاتا ہے وہ کسی ایسی پریشان حال لڑکی یا لڑکے کے خط کا القاب ہوتا ہے۔

جو اپنے خط کا آغاز اس انداز میں کرتا ہے۔ ”میری ماں سے زیادہ مہربان..... میرے خیال میں آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔“

ڈورتھی ڈکس کا اپنا کوئی بچہ نہیں۔ شاید اسی لئے یہ القاب اسے بے حد پسند ہے۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مسولینی

اس نے پانچ لاکھ آدمی محض اس لئے موت کی بھینٹ چڑھا دیئے کہ اسے بیسویں صدی کا جولیس سیزر کہا جائے۔

اس صدی کے آغاز میں ایک شخص سوئزرلینڈ میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس نے امریکہ میں دولت کی فراوانی کے متعلق حیرت ناک کہانیاں سن رکھی تھیں۔ لہٰذا ایک دن اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ہوا میں ایک سکہ اچھالا۔ اگر سر آیا تو وہ امریکہ چل پڑے گا۔ اور اگر دم آئی تو وہ سوئزر لینڈ ہی ٹھہرے گا..... دم آ گئی اور دنیا کی تاریخ کا رخ بدل گیا اگر یہ شخص امریکہ چلا گیا ہوتا تو عین ممکن ہے کہ اٹلی دوسری جنگ عظیم میں نہ کودتا۔ کیونکہ جس شخص نے سکہ ہوا میں اچھالا تھا وہ بینٹو مسولینی تھا اگر مسولینی امریکہ چلا جاتا تو شاید وہ دوسرا ال کپتون بن جاتا۔ اس صورت میں وہ یقیناً اٹلی کا آمر نہ بن سکتا۔ پھر شاید ہٹلر بھی اقتدار حاصل نہ کرتا۔ جب مسولینی نے پہلے آمرانہ اقتدار حاصل کیا۔ تو اس زمانے میں ہٹلر کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ مسولینی ہی سے ہٹلر نے آمرانہ اقتدار حاصل کرنے کے گر سیکھے تھے۔

اب ہم دوبارہ اپنی کہانی کی طرف آتے ہیں۔ 1904ء میں مسولینی اس ڈر کے مارے کہ اسے فوج میں زبردستی بھرتی نہ کر لیا جائے۔ ایک جعلی پاسپورٹ پر اٹلی سے سوئزر لینڈ بھاگ گیا۔ وہاں ابتدا میں ایک ریلوے سٹیشن پر قلی کا کام کرتا رہا۔ پھر وہ اینٹیں بنانے کا کام کرنے لگا۔ وہاں سے وہ ایک قصاب کی دکان پر ملازم ہو گیا اور لوگوں کے گھر گوشت دینے جایا کرتا۔ لیکن وہ ہمیشہ لوگوں سے جھگڑتا رہتا۔ جس کے سبب اسے ملازمت سے نکال دیا جاتا۔ وہ اکثر مفلوک الحال ہوتا اور پلوں کے نیچے رات بسر کرتا۔ اس کے کپڑے گندے اور پھٹے پرانے ہوتے بعض اوقات وہ اس قدر بھوکا ہوتا کہ اسے بھیک مانگنی پڑتی ایک دفعہ اس نے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے دو ایسی عورتوں کا کھانا چرا لیا جو پکنک منا رہی تھیں۔ ایک دوسرے موقع پر اس نے سونے کی گھڑی چرا لی پولیس نے اسے گیارہ دفعہ قید خانے کی سیر کرائی۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بچپن میں مسولینی کے پاس سونے کے لئے بستر نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک کتے کی طرح گھاس پھونس کے ایک ڈھیر پر سویا کرتا تھا۔ اس نے مفلسی اور نفرت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس کا والد جو ایک لوہار تھا' اسے امیروں' حکومت اور مذہب سے سخت نفرت تھی اس کی انقلابی کاروائیوں کے سبب اسے تین سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا اس نے اپنے بیٹے کا نام مشہور انقلابی لیڈر بینتو جارز پر رکھا۔ اس شخص نے میکسیکو کے بادشاہ کا تخت الٹ کر اسے گولی سے اڑا دیا تھا۔

مسولینی نے اپنا بچپن اس نفرت اور بغاوت کے ماحول میں بسر کیا۔ "میں ایک مضافاتی ڈاکو ہوا کرتا تھا۔" ہر وقت لڑنے مرنے کے لئے تیار اکثر جب میں گھر آتا۔ تو میرا سر پھٹا ہوتا۔ لیکن مجھے انتقام لینا آتا تھا۔

ہٹلر کی طرح مسولینی نے بھی اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی تلخ جوانی کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ بچپن میں وہ دوسرے لڑکوں سے لڑ بھڑ کر اقتدار حاصل کرتا تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ خود سے چھوٹے بچوں پر رعب گانٹھا کرتا۔ چالیس برس بعد اس نے چھوٹے چھوٹے ملکوں پر حملہ کرکے انہیں ہڑپ کر لیا۔ چھوٹے ملک جو اٹلی کے مقابلے میں اپنی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ اتھوپیا' البانیہ اور یونان جیسے ملک۔

مسولینی زندگی بھر عقب سے اور مکارانہ حملے کرتا رہا۔ ایک دفعہ لڑکپن میں جب ایک لڑکے نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تو وہ ایک نوکیلا پتھر لے کر جھاڑی کے عقب میں چھپ گیا اور جب وہ لڑکا وہاں سے گزرا تو اس کی پشت پر چھلانگ لگا کر اس کا چہرہ اس پتھر سے لہو لہان کر دیا آمر بننے کے بعد بھی وہ اسی قسم کے حملے کو ترجیح دیا کرتا تھا وہ اس قدر تیز مزاج اور اکھڑ تھا کہ اس کی والدہ نے اسے نرم مزاج بنانے کے لئے ایک مذہبی سکول میں بھیج دیا۔ لیکن وہاں بھی اس نے ایک لڑکے کی پشت میں چاقو گھونپ دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے چالیس برس بعد اس نے فرانس کی پشت پر حملہ کیا تھا۔ سکول سے اسے ان الفاظ کے ساتھ نکال دیا گیا۔ "تمہاری روح دوزخ کی طرح کالی ہے۔"

لیکن ان سب باتوں کے لئے مسولینی خود کو مورد الزام ٹھہراتا؟ ہرگز نہیں اپنے سوا وہ ہر کسی پر الزام دیتا۔ کئی برس بعد اس نے کہا تھا۔ "بچپن میں کوئی مجھ سے نرمی اور شفقت سے پیش نہ آتا تھا۔ میں ایک غریب گھر میں رہتا تھا۔ اور میری زندگی انتہائی تلخ تھی۔ مجھ میں شفقت کہاں سے آتی۔ پھر لوگ میری سخت گیری اور تیز مزاجی پر حیران کیوں ہوتے

ہیں۔"

جہاں کہیں بھی میسولینی گیا اس نے نفرت اور تشدد کا مظاہرہ کیا مثلاً ایک دفعہ زوروچ میں ایک ہوٹل کی ملازمہ نے اس کے خیال میں اس سے کھانے کے زیادہ دام وصول کر لئے تھے۔ وہ اس قدر مشتعل ہو گیا کہ تین اطالویوں کے ساتھ اس نے ہوٹل کی کرسیاں اور سامان توڑ دیا۔

مسولینی جس نے اطالویوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ خطرناک حد تک زندہ رہیں۔ بذات خود اس قدر بزدل تھا کہ سوشلسٹ اخبار "اوانٹی" کی ادارت کے دنوں میں اس نے ہمیشہ اپنے میز پر ایک چاقو اور ایک بھرا ہوا پستول رکھا ہوتا تھا۔ مسولینی کے اس زمانے کی زندگی کے بارے میں اس کی ایک نائب مدیر خاتون سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا اس خاتون کا کہنا ہے کہ وہ مسولینی کے اس ناقابل یقین خوف پر بے حد حیران تھی۔ مسولینی نے اس کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ وہ تو اپنے سائے سے بھی خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ وہ اس قدر بزدل تھا کہ اندھیرے میں اکیلا گھر جانے سے گھبراتا تھا۔ یہ حقیقت اسے اپنے دفتر کے دوسرے لوگوں کے سامنے تسلیم کرنے میں شرم محسوس ہوتی تھی۔ لہٰذا اس نے خاتون مدیرہ سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسے ہر روز اس کے گھر چھوڑ آیا کرے۔ وہ خاتون مسولینی کو اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر پھر اپنے گھر جایا کرتی۔

میں یہاں سنی سنائی باتیں یا گپیں نہیں دہرا رہا۔ یہ تمام باتیں اس خاتون نے ایک کتاب کی شکل میں لکھی ہیں۔ اس خاتون کا نام انجیلیکا بالانوف ہے۔ وہ کئی برس تک سوشلسٹ پارٹی کی سرگرم رکن رہی ہیں۔ ایسی خاتون کی باتوں پر شک و شبہ کا اظہار کرنا نادانی ہو گی۔

اٹلی کا آمر بننے کے بعد مسولینی کو قتل کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں۔ وہ اس قدر چوکنا ہو گیا کہ اس نے پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک پرائیویٹ فوج بنا رکھی تھی جو اس کے محل کی پوری طرح نگرانی کرتی۔

اگرچہ مسولینی نے پندرہ برس کی عمر سے پہلے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا تھا۔ لیکن عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس میں مطالعے کا شوق بڑھتا گیا۔ اس کے باوجود کئی الفاظ سے وہ بے حد توہم پرست واقع ہوا تھا مثلاً اس کا یقین تھا کہ انسانی تقدیر پر چاند کا گہرا اثر ہوتا ہے مسولینی جو اطالویوں کو خطرناک زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا تھا چاندنی میں سونے سے بے

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

حد گھبراتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ وہ تاش کے پتے دیکھ کر مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کر سکتا ہے۔ حکومت پر قبضہ کرنے کی خاطر روم پر تاریخی حملہ کرنے سے پہلے وہ کتنی دیر تک میز پر تاش کے پتے پھیلا کر ان کا بغور مطالعہ کرتا رہا تھا۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ ساری باتیں صحیح ہیں۔ یہ تمام باتیں مسولینی کی سرکاری سوانح حیات میں لکھی ہوئی ہیں۔ اس سوانح حیات کا اس نے خود مطالعہ کر کے اس کا تعارف بھی لکھا ہے۔

مسولینی بڑے غیر متوازن ذہن کا مالک تھا۔ پاگل خانے میں آپ کو کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور مل جائے گا۔ جو خود کو نپولین کہتا ہے۔ مسولینی خود کو اصلی جولیس سیزر تو نہ کہتا تھا۔ مگر خود کو جولیس سیزر ثانی ضرور کہا کرتا تھا۔ اس نے مجسمہ سازوں کو حکم دے رکھا تھا کہ اس کے مجسمے جولیس سیزر جیسے بنائے جائیں۔ 1926ء میں جب اس نے ٹریپولی کا دورہ کیا تھا تو ہزاروں اشتہاروں نے ان الفاظ سے اس کا استقبال کیا "خوش آمدید! سیزر!"

مسولینی خود کہا کرتا تھا "میں اپنی قوت ارادی سے تاریخ پر اپنے نشان چھوڑ جاؤں گا۔ میرے نشان شیر کے پنجوں کے نشانات سے مشابہ ہوں گے۔ یہ خواہش میرے دل و دماغ پر محیط ہے یہ مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔"

مذکورہ بالا جملے مسولینی کی ساری زندگی کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ یہ ایک انا پسند شخص کا اعتراف ہے۔ ایک ایسے شخص کا اعتراف جس نے پانچ لاکھ آدمی محض اس لئے موت کی بھینٹ چڑھا دیئے کہ اسے بیسویں صدی کا جولیس سیزر کہا جائے۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

بنگ کراس بے

اس نے اپنے گلے کے فالتو غدودوں کا بیس ہزار پونڈ میں بیمہ کرا رکھا ہے۔

آپ کے خیال میں اس دنیا کا سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا مغنی کون ہو گا؟ کروسو؟ ملچلار؟ ٹیٹ؟ ویل؟ ذرا پھر غور کریں۔ ہر دور کا سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا مغنی ایک ایسا شخص ہے جس نے زندگی میں فن موسیقی کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا! اور جس کی بہترین آواز فطرت کے ایک حادثے کا نتیجہ ہے۔

اس کا نام ہیری لیلس کراس بے ہے۔ وہ بڑا منچلا اور بانکا شخص ہے جو ہمیشہ یہ کہتا رہتا ہے۔ "میں لکھ پتی نہیں ہوں۔ لیکن اگر بن جاؤں تو کوئی حرج بھی نہیں۔" اس نے 150'000 پونڈ سے زیادہ دولت کمائی ہے۔ 1943ء میں بنگ کراس بے نے روز و یلٹ اور چرچل کی مشترکہ کمائی سے سات گنا زیادہ دولت کمائی تھی۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ اتنی ساری دولت کمانے میں اس کی محنت کے بجائے قسمت کو زیادہ دخل ہے۔

اس "چیچے" کا مستقبل (وہ خود کو اسی نام سے پکارا کرتا ہے) بیسویں صدی کی ایک حیرت ناک داستان کامیابی ہے۔ بنگ 1904ء میں پیدا ہوا۔ اس کے سر پر سے اس قدر بال اڑ چکے ہیں کہ اسے مصنوعی بالوں کی ٹوپی پہننی پڑتی ہے۔ ان کے کان اس قدر باہر نکلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ کسی فلم میں کام کرنے کے وقت انہیں میک اپ سے درست کیا جاتا ہے وہ محبت کے مناظر کے دوران میں بھی چیونگم کھاتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ لاکھوں عورتوں اور مردوں کا پسندیدہ ایکٹر ہے۔ جب جنرل میکارتھر اور اس کے سپاہی فلپائن میں دشمن کے گھیرے میں آگئے تو صدر روز و یلٹ نے بذریعہ وائرلیس جنرل میکارتھر سے پوچھا کہ سپاہیوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ جنرل میکارتھر نے اسے بتایا کہ اس کے آدمی بنگ کراس بے کے خواہشمند ہیں۔ زندگی اور موت کی اس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کشمکش میں بھی وہ اس مانوس آواز کو سننا چاہتے تھے۔ جس نے یہ گیت گایا ہے۔ "جب رات کی نیلاہٹ دن کے سونے سے ملتی ہے۔"

آج ہی نہیں بلکہ آج سے چھ ہزار سال بعد بھی آنے والی نسلیں مستقبل کے گرامو فون کے گرد بیٹھ کر ماضی کے پردوں کو چیرتی ہوئی بنگ کراس بے کی آواز سن سکیں گی۔ چند برس ہوئے اوگلے تھارپ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر تھارن ویل چیکوب سے کہا گیا کہ وہ وقت کے گنبد میں چند اشیاء رکھنے کے لئے ان کا انتخاب کرے "وقت کا گنبد" اکسویں صدی سے پہلے نہیں کھولا جائے گا۔ ڈاکٹر تھارن ویل نے دوسری اشیاء کے ہمراہ بنگ کراس بے کا ایک ریکارڈ بھی منتخب کیا اس کی وجہ؟ اس نے بتایا کہ ہمارے زمانے کا نمائندہ اسے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی چوبیس گھنٹوں میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا۔ جب دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں بنگ کراس بے کا کوئی ریکارڈ نہ بج رہا ہو۔

آپ اس کو ناقابل یقین باتیں کہیں گے۔ آپ کے خیال میں اس غیر معمولی آواز کا راز کیا ہے؟ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق بنگ کراس بے کے گلے میں چھوٹے چھوٹے فالتو غدود ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ایک ڈاکٹر نے بنگ کراس بے کو وہ غدود اپریشن کے ذریعے نکلوانے کا مشورہ دیا۔ لیکن کراس بے نے کہا نہیں جناب! انہیں غدودوں نے میری آواز کو ایک لوچ بخش رکھا ہے۔ آج اس نے وہ غدود 20'000 پونڈ میں بیمہ کرا رکھے ہیں۔

بعض لوگ بنگ کراس بے کو ست ترین زندہ آدمی کہتے ہیں جسے ہر چیز خوش قسمتی سے ملی اور جسے کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک دن بھی جدوجہد نہ کرنی پڑی۔ بہتر ہو گا کہ اس بات کا فیصلہ آپ خود ہی کریں' جب وہ لڑکا تھا تو تعطیلات کے دنوں میں جب کہ دوسرے لڑکے کھیل کود میں مصروف ہوتے اسے ایک فیکٹری میں کام کرنا پڑتا۔ 1931ء میں جب اسے پہلی دفعہ گانے کا موقع ملا تو وہ نیویارک کے پیرامونٹ تھیٹر کے سٹیج پر دن میں پانچ پروگرام دیا کرتا۔ پروگرام کے درمیان وقفے میں دو دفعہ ریڈیو پروگرام دیتا اور اس کے علاوہ گرامو فون کمپنیوں میں بھی اپنا گانا ریکارڈ کرانے جایا کرتا تھا۔ لہٰذا اگر وہ یہ کہتا ہے "میں بڑا خوش قسمت ہوں۔" تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس نے زندگی میں محنت نہیں کی۔

اگر آپ بنگ کراس بے سے پوچھیں کہ گانے کے سلسلے میں اس کی کامیابی میں سب سے بڑا دخل کس بات کو ہے تو وہ آپ کو بتائے گا کہ یہ طرز گفتگو کا ایک کورس تھا جو اس

نے کالج کے ایام میں پڑھا تھا طرزِ گفتگو کے اس کورس نے اسے جملوں کی ادائیگی سے آشنا کر دیا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا اگر میں مغنی نہ ہوتا تو طرزِ گفتگو کی کسی کلاس کا پروفیسر ہوتا یہ سب کچھ اسی تربیت کی بدولت ہے۔"

بنگ کراس بے لاکھوں عورتوں کا پسندیدہ ایکٹر ہے اس کے باوجود جب پہلے پہل اس نے اپنی بیوی ڈکسی لی کو شادی کی پیش کش کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اسے ایک کھلنڈرا لڑکا سمجھتی تھی جو سارے امریکہ کو کھیل کا میدان تصور کرتا تھا کہ ایک شخص نے ڈکسی لی کو تنبیہہ کی۔

"اگر تم نے بنگ کراس بے سے شادی کی تو ساری زندگی ملازمت کر کے اسے کھلاتی رہو گی۔"

یہ ایک ایسی چوٹ تھی جس نے بنگ کراس بے کے حواس ٹھکانے کر دیئے۔ ایک ہی رات میں اس نے اپنے مالی معاملات' اپنے والد اور بھائیوں کے سپرد کر دیئے اور ایک ایسا گھریلو آدمی بن گیا جو ہر اتوار گرجے جایا کرتا تھا۔ آج بنگ کراس بے اور ڈکسی لی کے چار بیٹے ہیں اور اس کی کمپنی کا نام بنگ کراس بے لمیٹڈ ہے اور اس کی شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بنگ کراس بے کو چیونگم اور تمباکو کے لئے پانچ پونڈ ہفتہ وار ملتے ہیں۔ اور اس کا باقی روپیہ اس کی فرم میں لگ جاتا ہے۔ اس کاروبار میں اس کے علاوہ اس کا والد اور بھائی بھی شریک ہیں۔

بنگ کراس بے سٹوڈیو میں اپنے دن کا آغاز کرنے کے لئے ہر روز صبح سات بجے اٹھتا ہے۔ لیکن وہ شاذ ہی اپنے دفتر کے قریب جاتا ہے ماسوا غسل کے لئے۔

اسے تیراکی کا بہت شوق ہے۔ نیویارک میں بین الاقوامی میلے میں ایک شرط جیتنے کے لئے ایک دفعہ اس نے پچاس فٹ کی بلندی سے غوطہ لگا کر تماشائیوں کو حیران کر دیا۔ اسے گاف سے اس قدر محبت ہے کہ بعض اوقات گاف کھیلنے کے لئے وہ صبح پانچ بجے اٹھ بیٹھتا ہے جین سیرازن کا کہنا ہے کہ اگر کراس بے سنجیدگی سے گاف کھیلے تو دوسرا بوبی جونز بن سکتا ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسے کام ہیں جو یہ کامل شخص نہیں کر سکتا۔ اور تو اور اس نے لکھنے لکھانے پر بھی طبع آزمائی کر رکھی ہے۔ اس نے بہت سی کہانیاں لکھ کر اپنے ایک صندوق

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

میں بند کر رکھی ہیں۔ اسے امید ہے کہ ایک دن وہ نامور رسالوں میں شائع ہوں گی۔ وہ اکثر اپنے ریڈیو اور فلم کے سکرپٹ پر نظرثانی کرتا ہے۔

یہ ایکٹر جو تیس سے زیادہ فلموں میں کام کر چکا ہے اس بات پر مصر ہے کہ اسے ایک چیز نہیں آتی۔ ایک دفعہ ایک رپورٹر نے اس سے پوچھا۔ "مسٹر کراس بے! ذرا یہ بتائیں کہ آپ کی پہلی فلم کون سی تھی جس نے پیرامونٹ والوں کو اس بات کا معتقد کر لیا کہ آپ اداکاری جانتے ہیں۔" کراس بے نے ہنس کر کہا۔ "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ یہ تو میں نے پہلی دفعہ سنا ہے کہ کوئی شخص میری اداکاری کا بھی معتقد ہے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

فیلڈ مارشل برنارڈ مونٹ گمری

پہلی جنگ عظیم میں اسے دفنانے کے لئے قبر کھودی گئی لیکن وہ دوسری جنگ عظیم کا عظیم ترین جرنیل بن گیا۔

گزشتہ 2'500 برس میں نو سو دو جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ اس کے باوجود برطانوی فیلڈ مارشل لارڈ مونٹ گمری نے جنگ کے فن میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس نے ایک ایسی جنگ لڑی جس کی مثال تحریر شدہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ وہ اور اس کی انگریز فوج "نیل کی فوج" نے جنرل رومیل اور اس کی افریقن کاریس کا صحرائے اعظم میں پندرہ سو میل تک تعاقب کیا۔

جنرل رومیل سے لڑائی کا آغاز کرنے سے پہلے لارڈ مونٹ گمری نے اپنے آدمیوں کو بتایا کہ وہ تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں سے ایک لڑائی لڑنے چلے ہیں۔ ایک لڑائی جو دوسری جنگ عظیم کا رخ بدل دے گی۔ اگر فیلڈ مونٹ گمری کو "الامین" کے مقام پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا تو جرمنوں نے مصر، نہر سویز اور عراق اور ایران کے تیل کے ذخیروں پر قابض ہو جانا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ہندوستان کو روندتے ہوئے جاپانیوں سے جا ملتے اور روس اور چین سے سامان رسد لانے کے تمام راستے بند کر دیتے۔ جب فیلڈ مارشل مونٹ گمری نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں سے ایک لڑائی لڑ رہے ہیں تو اس نے بالکل صحیح کہا تھا۔

اس کے باوجود اس بات کا بڑا امکان تھا کہ لارڈ مونٹ گمری کو کبھی الامین کی لڑائی لڑنی ہی نہ پڑتی۔ واقعہ یوں ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران وہ اس بری طرح زخمی ہوا کہ اس کے بچنے کی امید نہ رہی اور چند سپاہی اسے سٹریچر پر ڈال کر قبرستان کی طرف چل پڑے۔ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر اور مؤثر انداز میں یہ کہانی فیلڈ مارشل مونٹ گمری کی والدہ کی زبان سے سنیں۔

"برنارڈ چوٹ کھا کر گر پڑا۔" وہ لکھتی ہیں۔ "اس کا اردلی جس کے دل پر گولی لگی تھی برنارڈ کے اوپر جا گرا۔ برنارڈ بے ہوش پڑا تھا۔ لڑائی بند ہونے پر جب اسے اٹھا کر ڈاکٹر

کے پاس لے جایا گیا تو ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ شخص نصف گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہے گا۔"
کرنل نے اس کی قبر کھدوانے کا حکم دے دیا۔ برنارڈ کو ایک لاری میں ڈال کر وہ لوگ قبرستان کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ڈرائیور نے برنارڈ کو تھوڑا سا حرکت کرتے دیکھا تو اس نے چلا کر ڈاکٹر سے کہا۔ "جناب یہ لاش ابھی نہیں مری۔"

ہاں خدا کا شکر ہے کہ وہ لاش ابھی تک زندہ تھی۔ کیونکہ اب اسی لاش کو دنیا کا ایک بہترین برطانوی جنرل سمجھا جاتا ہے۔ جس کے جوہر دوسری جنگ عظیم نے روشن کر دیئے۔

اس بات کا بہت بڑا امکان تھا کہ فیلڈ مارشل لارڈ برنارڈ مونٹ گمری ایک بہترین جنرل کے بجائے ایک پادری بن جاتا۔ حقیقت میں وہ انگریز نہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ لندن میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن وہ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے آئرش ہے۔ اس کا والد تسمانیہ کا بشپ تھا اور برنارڈ مونٹ گمری سے بچپن ہی میں توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلے گا۔

لیکن 1899ء میں جب برنارڈ فقط بارہ برس کا تھا تو وہ لندن کے فٹ پاتھوں پر کھڑا جنگ بوئر میں جانے والے سپاہیوں کو دیکھا رہتا فوجی بینڈ ہوا کو فوجی ترانوں سے مرتعش کر دیتا۔ گلیاں اور بازار لوگوں سے بھر جاتے جو ہاتھ ہلا ہلا کر سپاہیوں کو الوداع کہتے۔ وہاں کھڑے کھڑے ننھے برنارڈ مونٹ گمری کے ذہن میں وہ ساری داستانیں گردش کرنے لگتیں۔ جو اس کی والدہ نے اسے سنا رکھی تھیں۔ اس کے دادا سر رابرٹ مونٹ گمری کے بارے میں داستانیں کہ وہ کس طرح پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر بن گیا تھا اور اس نے غدر کے دنوں میں کس طرح شہرت حاصل کر لی تھی۔ اسی زمانے میں اس بارہ سالہ لڑکے نے تہیہ کر لیا کہ پادری بننے کے بجائے وہ بھی اپنے دادا کی طرح ایک نامور فوجی راہنما بنے گا اور ایک دن وہ بھی جھنڈا ہاتھ میں پکڑ کر لندن کے بازاروں میں سے گزرے گا۔

فیلڈ مارشل مونٹ گمری کی والدہ نے اسے برطانوی تاریخ کے بڑے بڑے فوجی راہنماؤں مثلاً کرام ویل' کلایو' ڈریک اور نیلسن وغیرہ کے حالات زندگی سنا کر اس کے اندر زندگی میں کچھ کر گذرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

اس کی تربیت ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جہاں بہترین کتابیں اور ولولہ انگیز خیالات و نظریات موجود تھے۔ ایک دن اس کے والد نے اپنے چاروں بیٹوں کو اپنی لائبریری میں بلا کر کہا کہ اب وہ اس قدر بالغ ہو چکے ہیں کہ زندگی کے راستے کا خود ہی تعین کر سکیں۔ اس نے انہیں بتانے کی کوشش نہ کی کہ انہیں کیا کرنا چاہیے لیکن اس نے انہیں یہ ضرور کہا کہ

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

خواہ وہ کوئی راستہ بھی چنیں اپنے ملک اور قوم کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

ملک اور قوم کی خدمت کی تیاری کے لئے فیلڈ مارشل مونٹ گمری سینڈ ہرسٹ کی رائل ملٹری اکیڈمی میں داخل ہو گیا۔ اس نے گزشتہ چالیس برس ایک پیشہ ور فوجی افسر کی حیثیت سے بسر کئے ہیں۔

اس کی نمایاں کامیابی کا زیادہ تر انحصار اسی بات پر ہے کہ اس میں لوگوں کی قیادت کرنے اور ان کے اندر جوش پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جنگ میں کامیابی کے لئے پہلی ضروری چیز انسانی عنصر ہے۔ "ٹینک' جنگی لاریاں اور جنگی جہاز جنگ نہیں جیتتے۔ بلکہ ان کے اندر بیٹھے ہوئے انسان۔ ہر انسان کی آنکھوں میں جنگ کی چمک ہونی چاہئے۔"

اس نے اپنی آٹھویں فوج سے کہہ رکھا تھا کہ وہ روئے زمین پر بہترین فوج ہے۔ وہ عظمت کی امین ہے۔ اس نے ہمیشہ دشمن پر فتح پائی ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اعتماد میں لے کر بتا دیا کہ وہ ان سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ جب تک ان کے پاس فتح کے لئے ضروری سامان نہ ہو گا۔ وہ انہیں ہرگز جنگ کی بھٹی میں نہ جھونکے گا۔ فیلڈ مارشل نے اپنے آدمیوں کو بتایا کہ وہ جنگ کے دو اصولوں کو بہت مقدم سمجھتا ہے۔

1- کبھی جلد بازی کی کوشش نہ کرو۔

2- اس وقت تک کوئی تحریک یا حملہ شروع نہ کرو جب تک تمہیں اس کی کامیابی کا یقین نہ ہو۔ ایک دفعہ اس نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا تھا۔ "میں اس وقت کوئی جنگ نہیں لڑتا جب تک مجھے اپنی کامیابی کا یقین نہ ہو۔ اگر کسی لڑائی کے بارے میں مجھے ذرا بھی خدشہ ہو تو میں اس میں شامل نہیں ہوتا اور مکمل تیاری کرنے میں مصروف رہتا ہوں۔

فیلڈ مارشل مونٹ گمری فقط سپاہی ہی نہیں۔ وہ تیز نظروں والا ایک عقاب ہے۔ سپاہیانہ زندگی سے اسے والہانہ عشق ہے۔ اور میدان جنگ کی ولولہ انگیزی اس کی زندگی کی روح رواں۔ محاذ جنگ پر اس کے ہیڈ کوارٹر میں اس کی میز پر ہمیشہ دو کتابیں پڑی رہتی ہیں۔ ایک "پلگرم پروگرس" اور دوسری بائبل۔ اس نے ہر فوجی سے بائبل کا مطالعہ کرنے کی درخواست کی ہے۔ لہٰذا جب ونسٹن چرچل نے الیور کرامویل سے اس کا موازنہ کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ جب فیلڈ مارشل مونٹ گمری کے آدمی میدان جنگ میں جا رہے ہوتے ہیں تو

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ان کے لبوں پر مذہبی گیت ہوتے ہیں۔ بالکل کرامویل کی فوجوں کی مانند۔

آئزن ہاور۔ میکارتھر اور دوسرے جرنلوں کی طرح فیلڈ مارشل مونٹ گمری بھی کٹر مذہبی آدمی ہے۔ اس نے کبھی شراب نہیں پی۔ کبھی تمباکو نوشی نہیں کی اور نہ ہی کبھی قسم کھائی ہے۔ وہ ہر روز سونے سے پہلے دعا مانگتا ہے۔ اور اپنی آمدنی کا دسواں حصہ کلیسا کے نام پر دے دیتا ہے۔

وہ تنظیم پر بڑی سختی سے عمل کرتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے ایک فوجی کانفرنس میں یہ آرڈر جاری کیا تھا۔ "میں تمباکو نوشی اور کھانسنا پسند نہیں کرتا۔ اب کوئی سگریٹ وغیرہ نہیں پیئے گا۔ اب آپ کو دو منٹ تک کھانسنے کی اجازت ہے۔ اس کے بعد بیس منٹ تک کھانسنے کی اجازت نہیں۔ بیس منٹ کے بعد پھر ایک منٹ کے لئے کھانسنے کی اجازت ہو گی۔

فیلڈ مارشل مونٹ گمری اپنے دشمنوں سے ذاتی عناد اور نفرت نہیں رکھتا۔ اس کے بستر کے اوپر جنرل رومیل کی تصویر آویزاں رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کاش جنگ چھڑنے سے پہلے اس کی ملاقات رومیل سے ہو جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ایسا شخص جس سے میدان جنگ میں اس کا سامنا ہونے والا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجے پر بخوبی پہنچ سکتا تھا کہ اس کا دشمن اس کے خلاف کس قسم کی لڑائی لڑے گا۔

جب مونٹ گمری نے رومیل کے دست راست جنرل وان تھوما کو گرفتار کر لیا تو اس نے جنرل وان تھوما کو رات کے کھانے پر بطور مہمان مدعو کیا مونٹ گمری نے میز پوش پر اپنے جنگ کے طریقے کا نقشہ کھینچتے ہوئے اسے بتایا کہ رومیل کیوں کامیاب نہ ہوا تھا۔

جب مونٹ گمری بارہویں فوج کا کمانڈر تھا تو اس نے اپنے آفس کی دیوار پر یہ جملے لکھ رکھے تھے۔ "کیا آپ سو فی صد فٹ ہیں؟ کیا آپ کا دل زندہ ہے؟ کیا صبح بیدار ہوتے وقت آپ کے لبوں پر خوشی کا ترانہ ہوتا ہے؟"

ویسے یہ حقیقت ہے کہ صبح بیدار ہوتے وقت اس کے اپنے لبوں پر خوشی کا ترانہ نہیں ہوتا۔ خوشی کا کیا' کوئی بھی ترانہ نہیں ہوتا۔ اسے صبح چھ بجے اپنے روزمرہ کام کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ وہ پانچ بجے کے قریب چائے کی ایک پیالی پیتا ہے اور پھر آئندہ ایک گھنٹہ بستر پر نہیں لیٹتا تھا۔ دن بھر کے لئے منصوبہ بندی میں مصروف رہتا۔ وہ اپنے سارے دن کا پروگرام اس طرح مرتب کرتا ہے کہ اسے کسی کام میں جلد بازی نہیں کرنی پڑتی۔ محاذ جنگ پر بھی وہ ہر بات کو روزمرہ کے انداز میں لیتا ہے۔ اس نے لڑائی کا منصوبہ پہلے سے تیار کر

رکھا ہوتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ مناسب منصوبہ بندی کی بدولت ایک گولی چلنے سے پہلے ہی لڑائی جیتی جا سکتی ہے۔

جب لڑائی حقیقت میں شروع ہو جاتی ہے تو فیلڈ مارشل مونٹ گمری ستانے کے لئے ایک کیمپ میں چلا جاتا ہے۔ العلمین میں جب اتحادی توپ خانے نے جنرل رومیل کی فوجوں پر حملہ کرنا تھا تو وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے فیلڈ مارشل مونٹ گمری سونے کے لئے اپنے خیمے میں جا چکا تھا۔ ساڑھے چار گھنٹے بعد رات کے ڈیڑھ بجے اس کے ریڈی نے اسے لڑائی کی رپورٹ سنانے کے لئے جگایا۔ مونٹ گمری نے رپورٹ سن کر نئے احکام جاری کئے لمپ بجھایا اور دوبارہ سو گیا۔ اس کا یہ اعتماد اس کی عمدہ منصوبہ بندی فن جنگ میں مہارت' بہترین فوج اور شاندار سامان جنگ کی بدولت تھا۔

فیلڈ مارشل مونٹ گمری نے چالیس برس کی عمر سے پہلے شادی نہ کی۔ اس کا ایک بیٹا ڈیوڈ ہے۔ اس کی بیوی 1937ء میں فوت ہو گئی تھی۔ اپنی بیوی کی موت کا اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ ایک سال تک وہ اپنے گہرے دوستوں سے ملنے سے کتراتا رہا۔ اپنے بیٹے کے علاوہ خارجی زندگی میں اسے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں۔

لڑائی کے دوران بھی وہ اپنی والدہ کو خط لکھنے کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ جب جرمنی پر حملہ کرنے کے لئے اس نے رود بار انگلستان عبور کی تو اس کی والدہ نے اس کے ہاتھ گرم رکھنے کے لئے اسے دستانوں کا ایک جوڑا بن کر دیا۔ ایک اخباری نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ برنارڈ انہیں پہنے گا۔ اور گم نہ ہونے دے گا۔"

فیلڈ مارشل مونٹ گمری نے اپنے والد کی وہ نصیحت اپنی زندگی کا نصب العین بنا لی ہے جو اس نے اپنے چاروں بیٹوں کو کی تھی۔ "آپ ایک معزز خاندان کے افراد ہیں۔ اس کا مطلب ظاہری رکھ رکھاؤ نہیں۔ آپ کا ذہن بھی شائستہ اور شریف ہونا چاہئے جس میں کبھی کوئی گھٹیا اور ناخالص بات داخل ہونے کی جرات نہ کر سکے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

الفرڈ ای سمتھ

وہ فقط سات برس سکول گیا اس کے باوجود سات یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی ڈگریاں دیں۔

ساٹھ برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک آئرش ٹرک ڈرائیور نیویارک میں مر گیا۔ اپنی موت سے بہت عرصہ پہلے بیمار رہا تھا اور مجبوراً اس نے ٹرک ڈرائیوری چھوڑ کر چوکیداری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ جب وہ مرا تو اس قدر غریب تھا کہ اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام اس کے دوستوں اور ہمسایوں نے کیا' وہ اپنے پیچھے ایک بیوہ اور دو بچے چھوڑ گیا۔ اس کی بیوہ بڑی دانا عورت تھی اس نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو گا وہ اپنے بچوں کو تعلیم دے گی اسے چھتریاں بنانے والی ایک فیکٹری میں دس گھنٹے روزانہ کام کرنے کی شرط پر ملازمت مل گئی۔ لیکن اس کی مزدوری اس قدر کم ہوتی تھی کہ گھر کے اخراجات چلانے کے لئے اسے رات کو مزید تین چار گھنٹے کام کرنا پڑتا۔ اس طرح یہ ماں اپنے بچوں کے لئے ہر روز چودہ پندرہ گھنٹے کام کرتی۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ غریب عورت مستقبل کے پردے اٹھا کر یہ دیکھنے سے معذور تھی کہ اس کا چھوٹا بیٹا ایک دن نیویارک کا گورنر بن جائے گا۔ ایک دفعہ نہیں بلکہ چار دفعہ۔ اس عہدے پر اس سے پہلے کبھی کوئی اتنے طویل عرصے تک نہ رہا تھا۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ عورت یہ جاننے سے معذور تھی کہ 1928ء میں اس کا بیٹا ڈیمو کریٹک پارٹی کی طرف سے امریکہ کے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کے لئے نامزد کیا جائے گا۔ اس بیوہ کو کیا پتہ تھا کہ 5۔ مئی 1944ء کے شمارے میں نیویارک "ٹائمز" اس کے بیٹے کو نیویارک کا "محبوب ترین شہری" کہے گا۔

الفرڈ سمتھ کو یہ تمام اعزاز حاصل ہوئے۔ وہ نیویارک کی اس کارپوریشن کا صدر رہ چکا ہے جس نے دنیا کی بلند ترین عمارت امپائر سٹیٹ بلڈنگ تعمیر کی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ای سمتھ سے پوچھا کہ وہ کتنے برس سکول گیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کی جھجک کے بعد کہا۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

دیکھئے میں حساب لگا کر بتاتا ہوں۔ مجھے صحیح اعداد و شمار یاد نہیں۔ میں 1873ء میں پیدا ہوا تھا۔ میرے خیال میں سات آٹھ برس سکول گیا ہوں۔ لیکن میں اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ میں نے کسی یونیورسٹی سے سند حاصل نہیں کی جس سے پتہ چل سکے کہ میں سکول بھی جاتا رہا ہوں۔

ممکن ہے الفرڈ ایمونیل سمتھ کے پاس ایسے کاغذات نہ ہوں جو ثابت کر سکیں کہ وہ سکول جاتا رہا ہے لیکن اس کے پاس ایسی دستاویزات ضرور موجود ہیں جو اس بات کی ترجمان ہیں کہ چھ یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی سندیں دے رکھی ہیں۔ اور ان یونیورسٹیوں میں کیلے فورنیا اور ہاورڈ کی یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔

میرے یہ پوچھنے پر کہ کیا اسے کالج نہ جانے کا افسوس تھا۔ الفرڈ سمتھ نے نفی میں جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ اگر انسان سیاسی میدان میں کچھ کرنے کا خواہشمند ہے تو اس کے اندر دوست بنانے اور انسانی فطرت کو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہونی چاہئے۔ اس کا خیال ہے کہ اس نے فلٹن فش مارکیٹ اور عدالت میں بطور پیادہ آٹھ برس کام کر کے کالج میں کچھ سیکھنے کی نسبت انسانی فطرت کو زیادہ سمجھا ہے۔

جب الفرڈ دس برس کا تھا تو وہ ایک گرجے میں ملازم تھا جہاں اسے ہر روز صبح پانچ بجے اٹھ کر چھ بجے کی عبادت کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔

بارہ برس کی عمر میں وہ بندرگاہ پر اخبار وغیرہ فروخت کیا کرتا تھا۔ اپنے فالتو وقت میں وہ بروک لین پل کے نیچے بیس بال کھیلا کرتا۔ یہ پل اس کی آنکھوں کے سامنے تعمیر ہوا۔ لیکن اس زمانے میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا ولولہ فائر انجن پر سواری کرنا ہوتا تھا۔ وہ خود ایک فائرمین بننا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لئے کئی کئی گھنٹے فائر ہاؤس میں گزار دیتا۔ وہاں وہ فائر مینوں کو اپنے گیتوں اور رقص سے محظوظ کیا کرتا۔ جب کہیں سے کسی آتشزدگی کی اطلاع آتی تو وہ فوراً" چائے کی کیتلی اور سینڈوچز کی ٹوکری پکڑ کر فائر مینوں کے ساتھ فائر انجن پر سوار ہو جاتا۔

ای سمتھ ایک گندی اور خستہ حال گلی میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اس گلی کا ایک سرا اس کے پرستان یعنی دریائے ایسٹ پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ جہاں خوبصورت بادبانی جہاز اور کشتیاں پریوں کی طرح دریا کے سینے پر محو خرام ہوتیں بچپن میں ای سمتھ ان جہازوں اور کشتیوں پر کھیلتا رہتا اور بادبانوں کے رسوں پر چڑھ جاتا۔ ایسٹ دریا اس کا سوئمنگ پول تھا اور وہ کئی

کئی گھنٹے جہازوں اور کشتیوں کے درمیان تیرتا رہتا۔

ای سمتھ کے پاس وہ چیز تھی جس کے خواب لاکھوں لڑکے دیکھتے ہیں ــــــ ایک ذاتی چڑیا گھر۔ یہ چڑیا گھر مختلف رنگوں کے طوطوں، بندروں اور دوسرے چھوٹے موٹے پرندوں پر مشتمل تھا۔ یہ طوطے بندر اس نے ایموزون سے آنے والے جہاز رانوں سے خریدے ہوئے تھے۔ "جب کسی جہاز ران کو پیسوں کی کمی آجاتی اور اس نے واپس جانا ہوتا تو اس صورت میں اس سے سودا بازی کرنی بہت فائدہ مند رہتی۔ ال سمتھ نے مجھے بتایا۔

"ایک زمانے میں تو میرے پاس ایک بکری، چار کتے ایک طوطا اور بندروں کا ایک جوڑا ہوتا تھا۔ یہ سب کے سب ہمارے مکان کے بالائی کمرے میں بڑے سکون اور ہم آہنگی سے رہا کرتے۔ آخر مجھے اپنی والدہ کے بار بار کہنے پر بکری کو نکالنا پڑا۔ بات دراصل یہ تھی کہ بکری سے ایک تو بو بہت آتی اور پھر وہ شور بھی بہت مچایا کرتی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ جانوروں سے اسی محبت نے اسے تیس برس بعد جب وہ نیویارک کا گورنر تھا۔ ایک چڑیا گھر بنانے کی تحریک دی۔ یہ چڑیا گھر گورنر ہاؤس کے عقب میں تھا اور اور طرح طرح کے جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک رات کسی نے بندروں کے پنجرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ بندر وہاں سے فرار ہو کر درختوں کے راستے البانی کی سمت چل پڑے جب الفرڈ سمتھ کو پتا چلا تو وہ حکومت کے معاملات چھوڑ چھاڑ ہاتھوں میں تین کیلے لئے نصف گھنٹے تک بندروں کو درختوں سے نیچے اترنے کی ترغیب دیتا رہا۔ لیکن بندر بھی بڑے مکار تھے۔ انہوں نے گورنر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کیلوں پر کوئی توجہ نہ کی۔ اور اسے ستانے میں مصروف رہے۔ اگرچہ بعد میں رات گئے وہ پنجرے میں لوٹ آئے مگر الفرڈ سمتھ کی کوششوں کے سبب نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ بھوکے تھے اور انہیں نیند آرہی تھی۔

جب ای سمتھ چودہ برس کا تھا۔ تو اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جس نے اس کے مستقبل کو ایک واضح راستہ دکھا دیا۔ اس نے سکول میں ایک مباحثے کا مقابلہ جیت لیا۔ اس معرکے نے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی۔ اسے جلدی ہی "سینٹ جیمز پلیئرز" نامی ایک غیر معمولی تنظیم میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ شوقیہ اداکاروں کا ایک گروپ تھا۔ جو براڈوے کے ڈرامے بروک لینن اور نیویارک میں کھیلا کرتا تھا۔ یہ لوگ اپنی آمدنی سے ایک غریب گھر اور ایک یتیم خانہ چلاتے تھے۔ ایک شوقیہ اداکار کی حیثیت سے ای

سمتھ بہت کامیاب ہوا۔ تماشائی اس کا خوبصورت تبسم اور پرکشش شخصیت پسند کرنے لگے۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ سینٹ جیمز پلیئرز کا ایک نمایاں رکن بن گیا۔ یہ گروپ اسے ایک نئی دنیا میں لے آیا۔ دن کا وقت وہ دو پونڈ دس شلنگ ہفتہ وار تنخواہ پر فلٹن فش مارکیٹ میں بارہ گھنٹے کام کرتا۔ مگر اس کی رات روشنیوں اور میک اپ کے شہر میں بسر ہوتی۔ رات کے وقت وہ ہیرو ہوتا اور تماشائیوں کی تالیوں کی آواز پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ اداکاری کے اس تجربے نے اس کی جسمانی حرکات و سکنات میں آزادی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہجوم کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کی قابلیت بھی پیدا کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ایک ٹرک کی پشت پر کھڑا ہو کر گلیوں اور بازاروں کی نکڑ پر لوگوں کے سامنے سیاسی تقریریں کرنے لگا۔ اس زمانے میں وہ ایک مزدور تھا۔ اور بروک لین کی ایک پمپ فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود جب وہ دوپہر کو کھانے کے وقفے کے دوران اپنی ماں کے بنائے ہوئے سینڈوچز کھانے میں مشغول ہوتا تو ساتھ ہی ساتھ نیویارک سٹیٹ اسمبلی کا رکن بننے کے خواب بھی دیکھتا۔ یہ خواب کئی سال بعد پورا ہوا۔ مگر اس دوران وہ عدالت میں ایک پیادے کے طور پر کام کرتا رہا۔

آٹھ برس تک وہ اس حیثیت سے لوگوں میں سمن تقسیم کرتا رہا۔ اس کام میں اسے معاشرے کے مختلف طبقوں کے لوگوں سے واسطہ پڑتا۔ اس تجربے نے اسے انسانی فطرت کے بہت سے پہلوؤں سے واقف کرنے کے علاوہ مسکرا کر لوگوں کی گالیاں برداشت کرنا بھی سکھا دیا۔ جن لوگوں کے سمن وہ لے کر جایا کرتا۔ ان میں سے کم از کم بیس فیصد اسے ضرور لعنت ملامت کرتے۔

جب ای سمتھ 1904ء میں سیاست کی دستور ساز اسمبلی کا رکن بن کر البانی میں آیا تو اس وقت اس کی عمر فقط تیس برس تھی۔ اس سے پہلے اسے کسی ہوٹل میں رات بسر کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ رات کو ایک ہوٹل میں نام درج کرانے کے بعد جب وہ سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں گیا تو بستر پر لیٹے لیٹے اس کی نظروں سے ایک خبر گذری۔ وہ خبر شکاگو کے ایک ہوٹل کے بارے میں تھی جس میں آگ لگ جانے سے بہت سے لوگ بھسم ہو گئے تھے۔ وہ رات بے حد سرد تھی۔ وہ سارا ہوٹل لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ای سمتھ نے ہوٹل کے ملازموں کو ہوٹل کے کمرے گرم رکھنے کے لئے آتش دانوں میں آگ جلاتے ہوئے

دیکھ لیا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ ای سمتھ نے سوچا کہ اگر کسی آتش دان سے کوئی چنگاری اڑ کر ادھر ادھر جا گری تو ہوٹل کو آگ لگنے کا بہت امکان ہے۔ اس کا کمرہ ساتویں منزل پر ہے۔ اس صورت میں آگ سے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ نیویارک کا یہ آئندہ گورنر ہرگز آگ میں جلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ خاص طور پر جبکہ ہوٹل میں قیام کا پہلا اتفاق تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے ایک دوست کو اپنے پاس بیٹھنے پر آمادہ کر لیا۔ اور وہ دونوں صبح کے پانچ بجے تک تاش کھیلتے رہے۔ پھر وہ باری باری سونے لگے تاکہ بے خبری میں آگ میں جل کر مرنے سے بچ سکیں۔

البانی میں مجلس دستور ساز کے طریق کار پر ای سمتھ کو ابتداء میں بڑی حیرت ہوا کرتی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اسمبلی میں جس قدر بل پیش ہوتے تھے وہ ان کا بغور مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کس چیز سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بڑے طویل اور پیچیدہ اور غیر واضح ہوتے تھے اور اسے ایک ایسا اہم کام دیا گیا جس سے عہدہ برا ہونے کی اس نے تیاری نہ کی تھی۔ اسے بنک کاری کے متعلق ایک کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ مگر اس عمر تک وہ کبھی کسی بنک بھی نہ گیا تھا۔ ماسوائے کچہری میں ملازمت کے دنوں میں جب وہ کسی بنک کے کسی ملازم کو سمن دینے جایا کرتا تھا۔ اسے جنگلات پر ایک کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس نے کبھی کسی جنگل میں قدم نہ دھرا تھا۔ مجلس دستور ساز میں پندرہ ماہ کام کرنے کے بعد وہ اس قدر شکستہ خاطر ہو گیا کہ اس نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ ارادہ اسے محض اس لئے ترک کرنا پڑا کہ وہ اپنے احباب اور والد کے سامنے اپنی شکست تسلیم نہ کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے باپ سے کہا۔ "میں ہر مشکل پر قابو پاتا رہا ہوں۔ اس پر بھی قابو پا کر رہوں گا۔"

اس کے بعد وہ ہر روز پندرہ گھنٹے بلوں اور قراردادوں' قانون بنانے اور مجلس قانون ساز کا طریق کار سمجھنے پر صرف کرنے لگا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے سینکڑوں موضوعات پر مشتمل ایک طویل قرارداد کو حرف بہ حرف پڑھے بغیر اس کے حق میں ووٹ ڈالنے سے انکار کر دیا۔ وہ عوام اور ٹیکس ادا کرنے والوں کا پیسہ اتنی احتیاط سے صرف کرنا چاہتا تھا۔ جیسے وہ اس کا اپنا پیسہ ہو۔ اگر کسی محکمہ کو آٹھ سینئر کلرکوں کی ضرورت ہوتی تو ای سمتھ یہ پوچھنے پر مصر ہوتا کہ کن لوگوں کو لیا جائے گا۔ وہ کیا کام کریں گے اور ان کی کیا ضرورت ہے۔

البانی میں آنے کے نو برس بعد ای سمتھ کو سٹیٹ اسمبلی کا سپیکر بنا دیا گیا اس زمانے

میں حکومت کے طریق کار کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی شخص علم نہ رکھتا تھا۔

1911ء میں جب نیویارک کی ایک فیکٹری میں آتش زدگی سے 148 مرد عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ تو دوسرے لوگوں کی طرح ای سمتھ کو بھی اس حادثے پر سخت صدمہ ہوا۔ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ فیکٹریوں کی حالت سدھارنے اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچا کر رہے گا۔ اس سلسلے میں اس نے ریاست نیویارک کی مجلس دستور ساز سے کئی قوانین منظور کرائے بعد میں یہ اصلاحات دوسری ریاستوں اور دوسرے ممالک نے بھی اپنا لیں۔

جب فورتھ وارڈ کے کرتا دھرتا ٹام فولی نے ای سمتھ کو نیویارک کی مجلس دستور ساز میں بھیجا تو اس نے اسے نصیحت کی۔ "ای، کبھی کوئی ایسا وعدہ نہ کرنا جسے تم پورا نہ کر سکو۔ اور ہمیشہ سچ بولنا۔"

ای سمتھ نے زندگی بھر ان الفاظ پر عمل کیا اور جہاں کہیں بھی گیا اور جس عہدے پر بھی رہا۔ اس نے سچائی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

لارڈ بیور بروک

وہ اپنے مذاق اڑانے کے لئے ایک کارٹونسٹ کو دس ہزار پونڈ سالانہ دیا کرتا تھا۔

وہ شخص جس نے 1940ء میں انگلینڈ کو بچایا اور امریکہ کو جنگ کی تیاری کے لئے موقع مہیا کیا۔ کینیڈا کے گھنے جنگلات میں پیدا ہوا تھا اور اپنی زندگی کے پہلے اڑتیس برس میں میکس ایٹکن کے نام سے مشہور تھا۔ لیکن آج دنیا اسے لارڈ بیور بروک کے نام سے جانتی ہے۔

لارڈ بیور بروک نے 1940ء میں انگلینڈ کو بچانے میں کس طرح مدد کی تھی؟ آپ کو جنگ کے وہ تاریک دن تو یاد ہی ہوں گے، جب لندن لیور پول اور دوسرے شہروں میں جرمنوں کے بم پھٹ رہے تھے۔ وہ دن جب برطانوی سلطنت کی سلامتی مشکوک نظر آتی تھی۔

ان ایام میں ونسٹن چرچل نے محسوس کیا کہ اگر جنگی طیاروں کی پیداوار دگنی نہ کی گئی تو انگلینڈ ہار جائے گا۔ تیس دن کے اندر اندر جہازوں کی پیداوار دگنی کرنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ لہٰذا چرچل نے یہ کام انجام دینے کے لئے اس "معجزہ گر" کی خدمات حاصل کیں۔ لارڈ بیور بروک نے مئی 1940ء اور اگست 1940ء کے درمیانی عرصے میں برطانوی جہازوں کی پیداوار نو سو ماہوار سے اٹھارہ سو ماہوار کر دی اور اس طرح انگلینڈ کو جرمنوں کے حملے سے بچا لیا اور آئندہ ایک ہزار سال تک تاریخ کا رخ بدل دیا۔

لارڈ بیور بروک نے بہت کم تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ ایک طویل عرصے تک سکول نہ گیا اور جب سکول جانے لگا تو وہ تعلیم کے بجائے لڑکوں سے لڑنے جھگڑنے میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ وہ سکول میں اس قدر ہنگامہ بپا کرتا کہ تقریباً ہر روز استاد اس کی پٹائی کرتا۔ شروع شروع میں اس نے جس کام پر ہاتھ ڈالا اس میں ناکام رہا۔ ایک بیمہ ایجنٹ کی حیثیت سے وہ ناکام رہا۔ سلائی کی مشین فروخت کرنے میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے ایک اخبار نکالا مگر وہ بھی نہ چل سکا۔ ایک لاء سکول میں داخل ہونے کے لئے اس نے امتحان دیا تو اس

میں بھی پاس نہ ہو سکا۔

بیس برس کی عمر میں وہ بھوکا ننگا تھا۔ لیکن تیس برس کی عمر میں اس کے پاس لاکھوں روپے تھے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اسے کینیڈا میں ایک بنکر کے پاس بطور سیکرٹری ملازمت مل گئی۔ پھر اس نے اپنی دوڑ دھوپ کی بدولت کئی بنک' لوہے کے کارخانے اور بجلی گھر قائم کر لئے۔ دس برس میں اس کے پاس اتنا روپیہ آ گیا کہ کینیڈا کا کوئی دوسرا دولت مند اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ اس سے بھی بڑی فتوحات پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

وہ کینیڈا چھوڑ کر انگلینڈ چلا آیا اور سیاست میں حصہ لینے لگا۔ اس نے ایک سنسنی خیز سیاسی تحریک شروع کی اور پارلیمان کا ممبر منتخب ہو گیا۔ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس نے لندن کا ایک اخبار ڈیلی "ایکسپریس" خرید لیا۔ پہلے سال اسے اس اخبار میں 200'000 پونڈ خسارہ اٹھانا پڑا۔ دوسرے سال یہ خسارہ ایک تہائی رہ گیا اور آخر میں اس سے سالانہ 200'000 پونڈ نفع کمانے لگا۔ اس نے اخبار میں سنسنی خیز واقعات شائع کر کے حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وہ اپنے اخبار کے صحافیوں اور اس میں مضامین لکھنے والوں کو تحائف دیتا رہتا اور گھوڑے کی ریس پر اتنے اچھے اندازے شائع کرتا جو عموماً صحیح ثابت ہوتے۔

ڈیلی ایکسپریس کی اشاعت آٹھ سو فی صد بڑھ گئی۔ یہ 300'000 سے 2500'000 ہو گئی۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کسی اخبار کی اشاعت نہیں۔ کامیابی کے نشے میں چور لارڈ بیور بروک نے ایک اخبار "ایوننگ سٹینڈرڈ" خرید لیا اور ایک تیسرا اخبار "سنڈے ایکسپریس" خود جاری کیا۔ برطانوی وزارت کو بنانے اور توڑنے میں اب لارڈ بیور بروک کو بہت دخل تھا۔ لائیڈ جارج کو برطانیہ کا وزیراعظم بنانے میں اس کا بہت ہاتھ ہے۔

لیکن ایک چیز جس کا وہ دلی طور پر متمنی تھا اسے مل نہ سکی۔ وہ برطانیہ کا وزیراعظم بننا چاہتا تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اسے نظر انداز کیا جائے۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ پر ایک انعامی تنقیدی مضمون کا اعلان کیا۔ اور یہ انعام اس کے ایک ملازم نے حاصل کیا۔

جب وہ انگلینڈ کے ایک ذہین کارٹونسٹ ڈلوڈلو نے ایک دوسرے اخبار میں لارڈ بیور بروک پر حملہ کیا تو لارڈ بیور بروک نے اس سے کہا۔

"لو! اگر تم میرے اخبار میں ملازم ہو کر کارٹونوں کے ذریعے میرا مذاق اڑاؤ تو میں

تمہیں سالانہ دس ہزار پونڈ دیا کروں گا۔"

لو نے یہ پیش کش قبول کر لی وہ اکثر اپنے مالک کے مضحکہ خیز کارٹون بنایا کرتا تھا۔

1943ء میں لارڈ بیور بروک نے چرچل کی وزارت میں یکے بعد دیگرے پانچ وزارتیں سنبھالیں۔ پہلے وہ ہوائی جہازوں کی پیداوار بڑھانے کے شعبے کا وزیر تھا۔ پھر وہ وزیر ریاست اور پھر پیداوار کا وزیر بنایا گیا۔ اس کا آخری عہدہ لارڈ پریوی سیل کا تھا۔

انگلینڈ میں لارڈ بیور بروک کو اکثر "دی بیور" کہا جاتا ہے۔ اپنا موجودہ نام کو اس نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ کینیڈا میں بچپن کے ایام میں وہ اکثر بیور بروک نامی ایک ندی سے مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ وہ ہر روز گھڑ سواری کرتا ہے اور گھڑ سواری کے دوران میں حبشیوں کے مذہبی گیت گاتا رہتا ہے۔

ایک زمانے میں دو حجام بیک وقت لارڈ بیور بروک پر "مصروف کار" رہتے تھے۔ ایک اس کی شیو بناتا اور دوسرا اس کے سر کے بال تراشتا۔ آخر وقت بچانے کی خاطر اس نے ایک برقی بال تراش خرید لیا۔ اور اب وہ اپنے سر کی حجامت بھی خود ہی کرتا۔

ایک زمانے میں اس نے ایک چھوٹا سا ریڈیو خریدا اور اسے ایک دھاگے میں پرو کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ وہ موسیقی کی دھن پر اکثر رقص کرتا رہتا۔ اس نے اپنے مکان کے ہر کمرے میں ٹیلی فون لگوا رکھے ہیں۔ ان میں غسل خانے بھی شامل ہیں۔ پانی کے ٹب میں بیٹھا وہ اکثر دیر دیر تک ٹیلی فون پر باتیں کرتا رہتا ہے۔

وہ آٹھ پونڈ میں جوتوں کا جوڑا خریدتا ہے لیکن اس کا سوٹ جوتوں سے نصف قیمت کا ہوتا ہے۔ اس کی قمیض بڑے قیمتی کپڑے کی ہوتی ہیں مگر جب کسی کف کا کوئی بٹن ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اس کی جگہ اکثر سیفٹی پن استعمال کرتا ہے۔

لارڈ بیور بروک نے اپنے مکان کے قریب قبروں پر نصب کیا جانے والا صلیب کا ایک بڑا سا نشان لگوا رکھا ہے جو رات کے وقت بلبوں کی روشنی میں جگمگاتا ہے۔ لارڈ بیور بروک کا کہنا ہے کہ یہ نشان اسے یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ وقت بھاگا جا رہا ہے اور ہمیں ہر لمحے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے کیونکہ موت ہماری گھات میں بیٹھی ہے۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

جنرل چارلس ڈیگال

اسے زندہ یا مردہ پکڑنے کے لئے چالیس ہزار پونڈ انعام رکھا گیا۔

11- نومبر 1918ء کو مغربی محاذ پر گولہ باری بند ہو گئی۔ خونی جنگ جو زیادہ تر سرزمین فرانس پر لڑی گئی تھی۔ آخرکار چار برس کی آتش فشانی کے بعد ختم ہو گئی۔ بلجیم سے کوہ الپس تک اتحادی فوجوں کی تاریخ میں ایک شاندار باب کا اضافہ ہو گیا۔

بیس برس بعد ایک زیادہ بھیانک اور خون ریز جنگ نے دنیا کو دبوچ لیا اور فرانس پھر اس کے پنجے میں گرفتار ہو کر کراہنے لگا۔ فرانس کی چیخ و پکار کے درمیان فقط ایک ایسی آواز تھی جو عوام کو امید کا پیغام دے رہی تھی۔ لیکن اس آواز بلند کرنے والے شخص پر 1940ء میں ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور اسے مجرم قرار دے کر موت کی سزا سنائی گئی۔ وہ روئے زمین پر سب سے زیادہ نفرت اور محبت کیا جانے والا شخص ہے۔ اس کا نام چارلس ڈیگال ہے۔

جب جرمن کا پنسراز ڈویژن فرانس کو بڑی تیزی سے کچل رہا تھا۔ تو فقط چارلس ڈیگال ایک ایسا شخص تھا۔ جس نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ فرانس کے مغلوب راہنماؤں نے جرمنوں کے ساتھ جن ہتک آمیز شرائط پر ہتھیار ڈالے' چارلس ڈیگال نے انہیں تسلیم نہ کیا۔ وہ بھاگ کر انگلینڈ چلا آیا۔ جہاں اس نے فرانس کی آزادی کی خاطر جدوجہد جاری رکھی۔ جرمنوں کی اکثریت پر مبنی فرانس کی وچی حکومت نے اعلان کر دیا کہ جو شخص جنرل ڈیگال کو مردہ یا زندہ پکڑ کر لائے گا اسے 40'000 پونڈ انعام دیا جائے گا۔ لیکن لاکھوں فرانسیسی جو جرمن سنگینوں کے نیچے جی رہے تھے۔ ان کے نزدیک جنرل ڈیگال آزادی کی علامت تھا۔

کیا آپ کو 11- نومبر 1918ء کا دن یاد ہے؟ وقت کے آغاز سے اب تک وہ دن سب سے زیادہ ولولہ انگیز تھا۔ لوگ خوشی اور جوش و خروش سے دیوانے ہو رہے تھے۔ جنگ کے

چار خونیں سالوں کے بعد اور پچاس لاکھ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ 1918ء میں ہم سب کا یقین تھا کہ اب آئندہ کوئی جنگ نہ ہو گی۔ اگر فرانس نے چارلس ڈیگال کی باتوں پر سنجیدگی سے توجہ نہ کی ہوتی تو ممکن ہے دوسری جنگ عظیم کا آغاز نہ ہوتا۔

اگر فرانس نے چارلس ڈیگال کے کہنے پر دس زرہ بکتر ڈویژن بنائے ہوتے تو ہٹلر کو کبھی ہمت نہ ہوتی کہ وہ اپنے تیز رفتار زرہ بکتر ڈویژن رائن لینڈ بھیجتا۔ ہٹلر کو آسٹریلیا اور پولینڈ پر حملہ کرنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔

جنرل چارلس ڈیگال پہلا شخص تھا جس کی دور رس نظروں نے دیکھ لیا کہ مستقبل کی جنگ کس قسم کی ہو گی۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "مستقبل کی فوج" تھا۔ اس کتاب میں اس نے مستقبل کی تیز رو جنگ کی پیش گوئی کی تھی۔

اس زمانے میں جو لوگ فرانس کی فوج کے کرتا دھرتا تھا۔ انہوں نے فرانس اور جرمن کی سرحد پر لوہے اور پتھروں کی ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دی' وہ اسے لوہے کی دیوار کہتے تھے۔ وہ مستقبل میں بھی پہلی جنگ عظیم جیسی جنگ کے خطوط پر لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خندقوں کی جنگ پیادہ فوجوں اور رسالوں کی جنگ۔

لیکن جنرل چارلس ڈیگال نے فرانس کے فوجی راہنماؤں کو متنبہہ کی کہ مستقبل کی جنگ میں لوہے کی دیوار بے سود ہو گی۔ اس نے انہیں بتایا کہ آئندہ جنگ میں جرمنی بلجیم پر حملہ کر کے بلجیم اور فرانس کی دو سو میل لمبی سرحد جہاں کوئی لوہے کی دیوار نہیں' وہاں سے فرانس میں داخل ہو جائے گا۔ اس نے انہیں بتایا کہ فرانس ایسے برق رفتار حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے ان خطوط پر تیاریاں کر رہا ہے جو نپولین کے زمانے کی یادگار ہیں۔ جبکہ ایک منٹ میں بارودی بندوق فقط دو دفعہ چلائی جا سکتی تھی۔ جنرل ڈیگال نے اپنے ملک کو خبردار کیا کہ آئندہ جنگ پٹرول سے چلنے والے انجنوں' زرہ بکتر گاڑیوں اور ٹینکوں کی جنگ ہو گی۔ وہ ہوائی جہازوں کی جنگ ہو گی جو چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ٹینک اٹھا کر ہوا میں پرواز کریں گے۔

لیکن فرانس کے فوجی راہنماؤں نے چارلس ڈیگال کے خیالات کا مذاق اڑایا۔ جنرل پیٹن نے چارلس ڈیگال کی کتاب ایک کو لطیفہ اور نامور جنرل ویگانڈ نے اسے فرانسیسی فوج پر

kutubistan.blogspot.com

ایک تخریبی تنقید قرار دیا۔ زرہ بکتر گاڑیوں کے دس ڈویژن تیار کیے جائیں؟ بالکل فضول۔ ٹینک اور زرہ بکتر گاڑیاں بنانے کے لئے اتنی فیکٹریاں کہاں سے آئیں گی؟ ان کا خرچ کس طرح برداشت کیا جائے گا۔ میدان جنگ میں ان کی دیکھ بھال کیسے ہو گی۔ یہ ٹینک اور گاڑیاں جنگلات سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں اور دلدلوں میں کس طرح لڑیں گی؟

فرانسیسی چارلس ڈیگال کے نظریئے کو ناقابل عمل خیال کرتے تھے۔ لیکن جرمنوں نے اس کتاب کو فقط پڑھا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا گہرا مطالعہ کیا تھا انہوں نے اس کتاب کو ایک عملی شکل دے دی۔ یہ حقیقت ہے کہ نازیوں کی زرہ بکتر فوج کے انچارج جنرل رومیل نے ہٹلر کی موجودگی میں کہا تھا کہ انہوں نے مشینی جنگ کے زیادہ تر خیالات چارلس ڈیگال کی کتاب میں سے اخذ کیے تھے۔

نازی نوجوان لوگ تھے وہ نئے اور انقلابی خیالات کے بھوکے تھے۔ انہوں نے ہو بہو ڈیگال کے خطوط پر اپنے پنسراز ڈویژن کی بنیاد رکھی اور اپنے زرہ بکتر کو پنسراز ڈویژنوں کی مدد سے ایسی برق رفتاری سے فتوحات حاصل کیں کہ تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ چالیس دنوں کے اندر اندر دس ہزار جرمن ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے پچاس لاکھ فرانسیسی فوج کو شکست دے دی۔ جی ہاں پانچ ہزار ٹینکوں اور تین ہزار ہوائی جہازوں نے پچاس لاکھ پاپیادہ فوج کے چھکے چھڑا دیئے۔

چھ ہفتوں سے کم عرصے میں جمہوریہ فرانس نے جرمنی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ جرمنوں نے بیس لاکھ فرانسیسی سپاہی قید کیے۔ اندازہ کیجیے بیس لاکھ قیدی۔ جنگ کی تاریخ میں ایسا واقعہ پہلے کبھی رونما نہ ہوا تھا۔ اس موقع پر ونسٹن چرچل نے کہا تھا۔

"اس سے پہلے کبھی اتنے تھوڑے آدمیوں نے اتنے زیادہ آدمی قید نہ کیے تھے۔"

لیکن ان چند وحشت ناک ہفتوں میں جنرل ڈیگال نے ثابت کر دیا کہ وہ لڑ سکتا ہے۔ جرمن سپاہی فرانس کو روندتے ہوئے بلا روک ٹوک سمندر تک پہنچے۔ آخر ابی وائل کے مقام پر جنرل ڈیگال کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا اور وہ جرمنوں کی صفیں چیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں فرانسیسی فوجوں نے یہی ایک فتح حاصل کی تھی۔

ایک دفعہ مجھے کمانڈر پیری بنی ڈکنس سے انٹرویو کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ جنرل ڈیگال کے ساتھ لندن میں ڈیڑھ برس کام کر چکا ہے اگرچہ جنرل ڈیگال باہر سے بڑا سرد

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

مہر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں ایک ایسا شعلہ نہاں ہے جو کسی وقت بھی جوالا مکھی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

اگرچہ اس کے ماتحت اس سے اکثر نالاں رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اس کے زیادہ قریب رہنے والے لوگ اسے "مائی جنرل" سے خطاب کرتے ہیں۔ وہ اقتصادیات' تاریخ اور فلسفے کی کتابیں شوق سے پڑھتا ہے۔ وہ بے حد مذہبی ہے۔ باقاعدہ کلیسا جاتا ہے اور رات کو عبادت کر کے سوتا ہے۔

جنرل ڈیگال بڑا شرمیلا شخص ہے اور اسی باعث وہ دوسروں سے بے تکلف نہیں ہوتا اور لوگ اسے مغرور خیال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ اس قدر سرد مہر ہے کہ اسے تو برف کے بکس میں رہنا چاہئے۔

ایام شباب میں جب ڈیگال فوج میں کیپٹن تھا تو اس کی ملاقات پیرس کی ایک آرٹ گیلری میں ایک دلکش فرانسیسی لڑکی سے ہوئی۔ اس لڑکی کو چائے کی دعوت دیتے وقت چارلس ڈیگال کو جس قدر جرات سے کام لینا پڑا شاید کسی میدان جنگ میں بھی اس نے اتنی جرات کا مظاہرہ نہ کیا ہو گا۔ چائے کے دوران میں وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے چائے کی پیالی لڑکی کے لباس پر گرا دی مگر پانچ ماہ بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں چارلس ڈیگال تین دفعہ زخمی ہوا۔ تیسری دفعہ زخمی ہونے پر وہ بے ہوش ہو گیا اور ایک جرمن گشتی دستے نے اسے قید کر لیا۔ وہ پانچ دفعہ جیل سے فرار ہوا اور پانچوں دفعہ دوبارہ پکڑا گیا۔ اور جنگ کا باقی عرصہ اس نے قید تنہائی میں گزارا۔ ایک دفعہ وہ فقط ایک چاقو سے خندق کھود کر فرار ہو گیا تھا۔

جب جنرل ڈیگال 18- جون 1940ء کو ہوائی جہاز کے ذریعے انگلینڈ آیا تو اس کے ساتھ نہ تو کوئی سٹاف تھا اور نہ ہی روپیہ پیسہ۔ ونسٹن چرچل نے بڑے جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا اور اسے حیران اور شکست خوردہ فرانس کے لئے پرامید پیغام نشر کرنے کے لئے کہا۔ ڈیگال نے اس نشریئے میں کہا کہ اگرچہ فرانس ایک لڑائی ہار چکا ہے۔ مگر وہ جنگ نہیں ہارا۔ اس نے فرانسیسی سپاہیوں اور مزدوروں سے درخواست کی۔ وہ انگلینڈ آ کر اس سے مل جائیں۔

اس کی درخواست پر دنیا بھر کے لوگ جمع ہونے لگے۔ فرانسیسی سپاہی اسلحہ چرا کر رودبار

انگلستان میں بڑے بڑے تختوں پر سفر کر کے انگلینڈ آنے لگے۔ بعض سپاہی ہوائی جہاز چرا کر انگلینڈ پہنچ گئے۔ ایک پائلٹ طالب علم جسے ائر فورس میں بھرتی ہوئے فقط پندرہ گھنٹے ہوئے تھے۔ اس نے تین تباہ شدہ جہازوں کے پرزے جمع کر کے ان سے ایک جہاز تیار کیا اور اڑ کر جبرالٹر چلا آیا۔

یہ تو ابھی آغاز تھا۔ ڈیگال نے جلد ہی افریقہ میں پانچ فرانسیسی نوآبادیوں کی حمایت حاصل کر لی اور آخر ڈیگال کی قیادت میں لڑنے والے فرانسیسی سپاہیوں نے فرانس کی وچی حکومت کو شام کا ملک ان کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا۔

ڈیگال نے اعلان کر دیا کہ جب تک فرانس بے دست و پا رہے گا۔ وہ یہ نعرہ بلند کر کے لڑتا رہے گا۔ "فتح یا موت۔ آزادی یا قبر۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

کارڈل ہل

ستره برس کی عمر سے پہلے اس نے ریل گاڑی نہ دیکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ دنیا کی ایک نہایت باا ثر شخصیت بن گیا۔

امریکی خانہ جنگی کے آخری ایام میں ٹینیسی کی پہاڑیوں کے ایک باشندے بلی ہل نامی نوجوان نے اپنے ہمسائے سے ایک چھوٹا سا سودا کیا اور اپنی گائے دے کر اس کی بندوق لے لی۔ چند ہفتوں کے بعد ہمسائے کو یہ سودا صحیح محسوس نہ ہوا اور ایک رات اس نے بلی ہل کے گھر چوری چھپے گھس کر بندوق اٹھالی۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمینی حرکت نے بلی ہل کو دیوانہ کر دیا۔ وہ ہمسائے کے گھر گیا۔ اور اسے ناقابل تحریر گالیوں کی فہرست سنا کر اس سے بندوق کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ہمسائے نے قسم کھائی کہ وہ اس ہتک کا بدلہ بلی ہل سے ضرور لے گا اور وہ اپنی قسم پر صحیح اترا۔ اس نے گرد و نواح کے رہنے والے باغی سپاہیوں کو اطلاع دی کہ بلی ہل حکومت کے وفادار سپاہیوں کے ہاتھوں اسلحہ وغیرہ فروخت کرنے کی خاطر بندوقیں چوری کرتا ہے۔ باغی سپاہیوں نے پہاڑیوں میں بلی ہل کا تعاقب کیا اور اسے گولی مار دی۔ ان کا خیال تھا کہ انہوں نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔ ایک گولی اس کے سر میں سے گزر گئی جس سے اس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ لیکن یہ بات معجزے سے کم نہیں کہ گولی اس کے مغز میں نہ لگی تھی۔ ایک کسان کی بیوی اسے اپنے گھر اٹھا لائی اور اس کی دیکھ بھال کر کے اسے دوبارہ صحت یاب کر دیا۔ بعد میں بلی ہل مزید اٹھاون برس زندہ رہا۔ اور وسط ٹینیسی میں ایک روایت بن گیا۔

بلی ہل نے کسی قسم کی مروجہ تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ اسے لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ بہر حال وہ ایک ہوشیار تاجر بن گیا اور جب وہ 1923ء میں فوت ہوا تو اپنے پیچھے 40000 پونڈ چھوڑ گیا۔ لیکن زندگی کے آخری دنوں تک بلی ہل نے کالر وغیرہ ہرگز نہ پہنا۔ وہ کہا کرتا کہ کالر پہننے سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور گردن زخمی ہو جاتی ہے۔

اپنی زندگی کے آخری حصے میں وہ زمستان میں فلوریڈا چلا جایا کرتا تھا۔ وہ تقریباً ایک پونڈ کی مالیت کے کپڑے ایک سستے سے بکس میں بند کرتا اور پھر کسی مسافر گاڑی کی بجائے

کسی مال گاڑی کے ڈبے میں سفر کر کے فلوریڈا پہنچ جاتا۔

لیکن اصل کہانی سے دور جا رہا ہوں..... جس شخص کے متعلق آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں وہ بلی ہل نہیں بلکہ اس کا بیٹا کارڈ ہل ہے۔ جب بلی ہل جوان تھا تو اس نے ورجینیا کی رہنے والی ایک ایسی سروقد لڑکی سے شادی کر لی جس کی رگوں میں حبشی خون کی آمیزش تھی۔ ان کے یہاں پانچ بچے پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے تیسرے بچے کا نام کارڈل رکھا۔ وہ پیار سے اسے "کارڈ" کہا کرتے تھے۔ کارڈ 1871ء میں پیدا ہوا۔ خانہ جنگی کے چھ سال بعد بلی ہل اپنے بیٹے کارڈل کے بارے میں یہ الفاظ لکھتا ہے۔

"کارڈ سکول ماسٹر بننے کے قابل نہ تھا' اتنا مہذب نہ تھا کہ ڈاکٹر بن سکے۔ اس کی آواز اتنی بلند نہ تھی کہ مبلغ بن سکے۔ لیکن کارڈ ایک صحیح مفکر تھا۔"

کارڈل ہل ایک صحیح مفکر ہی نہ تھا بلکہ بعد میں وہ ایک صحیح سیاست دان بھی بن گیا۔ گیارہ برس تک وہ امریکہ کا سیکرٹری آف سٹیٹ رہا۔ بلی ہل کا یہ بیٹا اور اس کی حبشی خون والی ماں ایک دن ان سیاست دانوں کی صف اول میں کھڑے ہو گئے۔ جو دنیا کا کاروبار چلاتے تھے۔

کارڈل کی داستان حیات زیادہ تر قانون اور سیاست کی کہانی ہے وہ کانگرس میں بائیس برس رہا اور اس نے زندگی کا دو تہائی حصہ عوامی عہدوں پر بسر کیا۔ وہ کہا کرتا کہ اسے کوئی ایسا وقت یاد نہیں۔ جب وکیل بننے کا خیال اس کے ذہن میں نہ ہو۔ اس نے وکیل بننے کا اس طرح مسلم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ دوسرے لڑکوں کی طرح تیرنے یا مچھلیاں پکڑنے بھی نہ جایا کرتا۔ جب دوسرے مچھلیاں پکڑنے یا دریا میں تیرنے میں مصروف ہوتے۔ تو وہ کسی درخت کے دو شاخے میں بیٹھا کتابیں پڑھنے میں مصروف ہوتا۔ اس کے باپ نے ایک دفعہ کہا تھا۔

"کارڈ نے جب چلنا سیکھا تو اسی وقت سے بالغوں جیسا برتاؤ کرنے لگا۔"

لڑکپن میں کارڈل ہل والد کے ہمراہ دریا کے ذریعے اپنے شہتیر وغیرہ لے کر نیش ویل جایا کرتا۔ اس سفر میں انہیں دس دن لگ جاتے جس کے دوران کارڈل ہل کھلے آسمان کے نیچے دھوپ اور بارش میں سویا کرتا۔ شہتیروں کو اس طرح دریا کے بہاؤ کی سمت لے جانے کا کام اسے پسند تھا۔ بلکہ اس کام کو تو وہ اپنا ایک پسندیدہ کھیل تصور کرتا تھا۔ نیش ویل کی نئی دنیا میں ایک ولولہ انگیز مہم۔ اسے نیش ویل کی گاڑیاں' تانگے اور ہوٹل بے حد مرغوب کرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ تر نیش ویل میں کتابیں خریدنے کے لئے جایا کرتا۔

کارڈل ہل نے اپنی طویل سیاسی زندگی میں سینکڑوں تقریریں کیں۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی اہم ترین تقریر چودہ برس کی عمر میں کی تھی۔ بات یہ تھی کہ کارڈل جانتا تھا کہ اس کا باپ اپنے پانچ بیٹوں میں سے فقط ایک کو کالج بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن کون سا بیٹا۔ اس کا فیصلہ ابھی اس نے نہیں کیا تھا۔ کارڈل نے تہیہ کر لیا کہ کالج کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ خود کو منتخب کرا کے رہے گا۔ اپنے والد کو مرعوب کرنے کی خاطر کارڈل نے ولو گرد سکول میں مباحثہ کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ایک مباحثے میں کارڈل کو یہ ثابت کرنا تھا کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کرنے پر جو روپیہ خرچ کیا وہ اس کا اس قدر مستحق تھا۔ جتنا جارج واشنگٹن امریکہ کے دفاع کے لئے اس روپے کا مستحق تھا۔ کارڈل جانتا تھا کہ اس گرما گرم مباحثے کو سننے اس کا والد بھی آئے گا۔ وہ کئی روز تک روز و شب تاریخوں کا مطالعہ کر کے حقائق جمع کرتا رہا اور تقریر مکمل کرنے کے بعد اس کی ریہرسل میں مشغول رہا۔ اسی ہفتے ولو گرد میں اساتذہ کی ایسوسی ایشن ایک کنونشن منعقد کر رہی تھی۔ کارڈل نے اس کنونشن میں شرکت کرنے والے ہر استاد سے یہ دریافت کیا کہ کولمبس اور واشنگٹن دونوں میں سے کس کو روپے کی زیادہ ضرورت تھی اور کیوں؟ کارڈل نے وہ مباحثہ جیت لیا اور اس کے باپ نے اسے گھر سے بارہ میل دور مونٹ ویل اکیڈمی نامی سکول میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔

اسی سکول میں تعلیم کے زمانے میں کارڈل نے شہر کے اندر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ کارڈل اپنا کھانا خود پکاتا۔ برتن خود صاف کرتا اور اپنا بستر وغیرہ خود لگاتا۔ جمعہ کی رات کو وہ بارہ میل کا سفر پیدل طے کر کے اپنے باپ کے فارم پر پہنچتا اور ولو گرد مباحثہ سوسائٹی کے پروگرام میں حصہ لیتا۔ پیر کی صبح کو وہ پھر بارہ میل پیدل طے کر کے مونٹ ویل اکیڈمی پہنچتا۔ قصبے میں یومیہ خرچ ایک شلنگ تین پنس سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔

مونٹ ویل کو ایک طرح سے جنوب کا ہاورڈ کہا جا سکتا تھا۔ وہاں فقط دو استاد تھے۔ ان میں سے ایک استاد جو ٹمکلن نے کارڈ ہل کو نہ صرف علم جراحی' جغرافیہ اور یونانی سکھائی بلکہ ان چیزوں سے ہزاروں درجے بہتر اور اہم ایک دوسری چیز دے دی۔ اس نے لڑکے کی قوت مشاہدہ تیز کر کے اس میں خود اعتمادی پیدا کر دی۔

مونٹ ویل اکیڈمی کی دیواروں پر یہ جملہ ہمیشہ لکھا رہتا تھا۔ میرے خیال میں اس ایک جملے نے اس کی زندگی بدل دی۔ اور اسے ہر روز بارہ چودہ گھنٹے کام کرنے کی عادت ڈال دی۔ وہ یہ جملہ تھا۔ "محنت شاقہ کے بغیر عروج حاصل نہیں ہوتا۔"

اس زمانے میں کارڈل ہل کو فقط ایک خواہش تھی۔ وہ سیاست دان بننا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کامیاب سیاست دان بننے کے لئے اسے تقریریں کرنی ہوں گی۔ لہٰذا اس نے فن تقریر کا مطالعہ کیا۔ وہ ہر جمعہ دوپہر کو سکول کے طلبہ کے سامنے نظمیں پڑھا کرتا۔

کارڈل ہل کو عمدہ تقریریں کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ اس نے ایک گھوڑا گاڑی کرائے پر لی اور اس زمانے کا مشہور سیاست دان بنٹن مکملن جہاں تقریر کرنے جاتا وہ اس کے پیچھے ہو لیتا تاکہ اس کی تقریریں سن کر وہ عملی طور پر کچھ سیکھ سکے۔ وہ سیاست دان بعد میں ٹینیسی کا گورنر بن گیا۔ کارڈل ہل تسلیم کرتا ہے کہ اس کی سیاسی زندگی پر مکملن کی تقریروں کا بہت اثر ہے۔

کارڈل ہل نے قانون کی سند کمبرلینڈ یونیورسٹی لاء کالج سے حاصل کر کے اتنی چھوٹی عمر میں وکالت کرنی شروع کر دی کہ ابھی وہ ووٹ بھی نہ دے سکتا تھا۔ اس کے پاس کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا موکل آ جاتا۔ لہٰذا وہ اپنا زیادہ وقت گلیڈ سٹون کی کتاب "کومنٹریز" کے مطالعے اور دوسرے وکیلوں کے ساتھ تاش کھیلنے اور ان کے تجربے سننے میں صرف کرتا۔

اتنی چھوٹی عمر میں کارڈل ہل بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ قصبے کے ان چند لوگوں میں سے تھا جو نیش ویل کے ایک ہفتہ وار اخبار "ہفت روزہ امریکن" کا خریدار تھا۔ یہ اخبار دخانی جہاز کے ذریعے اپنی اشاعت کے دو تین روز بعد وہاں پہنچتا۔ ٹینیسی کے اس علاقے میں لوگ باہر کی دنیا کی خبروں سے اس قدر بے خبر ہوتے تھے کہ جب اخبار وہاں پہنچتا تو لوگ خبریں سننے کے لئے کارڈل ہل کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ بلند آواز میں انہیں خبریں سناتا۔

اکیس برس کی عمر سے پہلے ہی وہ ریاست کی مجلس دستور ساز کا ممبر منتخب ہو گیا۔ جب وہ بائیس برس کا تھا تو اسے ایک گشتی عدالت کا جج بنا دیا گیا۔ وہ سال میں سے گیارہ مہینے گھر سے باہر رہتا۔ ٹینیسی کے لوگ آج بھی اسے جج ہل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی بیوی اجنبیوں سے گفتگو کرنے کے دوران کہتی ہے۔

جج کی حیثیت سے کارڈل ہل بڑا سخت اور غیر جانبدار تھا۔ ایک دفعہ اس نے خود اپنے باپ کو اس بات پر ایک پونڈ جرمانہ کر دیا کہ وہ کمرہ عدالت میں ہیٹ پہنے بیٹھا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر اس نے اس خاتون کی درخواست سننے سے انکار کر دیا۔ جس نے اس کے والد کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ وہ عورت کارڈل ہل کے پاس اپنے بیٹے کی سفارش لے کر آئی تھی جسے کلیسا کی عبادت میں دخل اندازی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ "اگر تم

نے اسے جرمانہ کر دیا یا وہ قید ہو گیا تو مجھے پیٹ پالنے کی خاطر کام کرنا پڑے گا۔" اس عورت نے کہا۔ جیوری نے تحقیق کی تو لڑکا واقعی مجرم نکلا۔ اور جج ہل نے اسے دس پونڈ جرمانہ کر دیا۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بیس پونڈ نکال کر لڑکے کی ماں کو دے دیئے۔ دس پونڈ لڑکے کا جرمانہ اور دس پونڈ اس کے لئے۔ یہ اتنی زیادہ رقم تھی کہ ایک پہاڑی کنبہ اتنے پیسے دو تین سال میں کما سکتا تھا۔

پینتیس برس کی عمر میں کارڈل ہل نے کانگرس کے لئے ایک ولولہ انگیز تحریک لڑی اور ساری ریاست کا گھوڑا گاڑی میں دورہ کر کے سترہ ووٹوں سے جیت گیا۔ اسی تگ و دو میں اس کی گاڑی کے تین پہیے ٹوٹے۔

جب 1906ء میں وہ واشنگٹن پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ سیاست میں آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسے خاص کام میں مہارت حاصل کرنی ہو گی۔ لہٰذا وہ پچیس برس تک ٹیکسوں اور محصولوں کا ماہر بننے کی جدوجہد کرتا رہا۔ بیالیس برس پہلے اس نے امریکہ کا پہلا ٹیکس قانون لکھا تھا۔ اس کا محصولوں کے متعلق علم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ "اگر آپ مجھے سات صفحات پر مشتمل محصولوں کے بارے میں کوئی کتابچہ دے دیں تو میں اسے سات کھانوں پر مشتمل ڈنر پر ترجیح دوں گا۔"

یہ بالکل صحیح ہے اسے دعوتوں وغیرہ سے نفرت تھی وہ سرکاری پارٹیوں کے سوا کہیں نہ جاتا تھا۔ وہاں بھی وہ بہت کم کھاتا اور دودھ کا ایک گلاس پی کر چلا آتا۔

ہل نے چھیالیس برس کی عمر میں ورجینیا کی ایک بیوہ عورت سے شادی کی۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ واشنگٹن کے ہوٹل چارلسٹن میں سات کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ جب دروازے پر کوئی دستک دیتا تو ہل خود دیکھنے جایا کرتا تھا۔

بہت سے لوگ جن میں جاپانی بھی شامل ہیں کارڈل ہل کو تسخیر نہ کر سکے' پرل ہاربر پر حملے سے ایک ماہ پہلے وہ امریکی قوم کو خبردار کرتا رہا۔ "جاپانی جلد ہم پر حملہ کر دیں گے۔" مگر پرل ہاربر کے لوگوں نے بھی اس کی آواز پر کوئی توجہ نہ دی۔

یہ ہے کارڈل ہل کی داستان جو ٹینیسی کے پس ماندہ علاقے سے آیا تھا اور جس نے سترہ برس کی عمر سے پہلے ریل گاڑی نہ دیکھی تھی۔

○

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

ہنری جے کیسر

اس نے فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کیا اور دنیا کے سب سے بڑے جہازوں کے کارخانے کا مالک بن گیا۔

دوسری جنگ عظیم نے جس تاجر کو سب سے زیادہ نمایاں کیا ہے وہ ہے ہنری جے کیسر۔ جنگ کو جیتنے میں اس نے بھی اتنی ہی کوشش کی ہے جتنی اتحادیوں کے حامی کسی دوسرے شخص نے۔ جنگ سے پہلے بہت کم لوگ ہنری' جے کیسر کے نام سے واقف تھے لیکن چند برس کے اندر اندر اس کی کاروباری سرگرمیاں حیران کن تھیں۔ اس کے سات بڑے بڑے شپ یارڈ تھے جن میں رات دن مسافر بار بردار جنگی جہازوں کے علاوہ ٹینک اور ہوائی جہاز اٹھانے والے بحری جہاز بنایا کرتے تھے۔ کیسر جنگی طیاروں اور ان کے پرزے بنانے والی ایک فیکٹری بھی چلایا کرتا تھا۔

جب کیسر کو اپنی ضرورت کے مطابق لوہا نہ ملنے لگا تو اس نے روکی پہاڑیوں کے مغرب میں اپنا لوہے کا کارخانہ قائم کر لیا۔ پھر اس نے اپنے کارخانے کو خام لوہا مہیا کرنے کے لئے لوہے کی کانیں خرید لیں اور کارخانے کی بھٹیاں گرم رکھنے کی خاطر کوئلے کی کانوں کی اجارہ داری لے لی۔

کیسر نے اپنی دوسری کمپنیوں کی مدد سے پرل ہاربر میں ڈوبے ہوئے جہاز باہر نکالے۔ انہوں نے ویک آئی لینڈ' مڈوے اور گرام میں نیوی کے اڈے تعمیر کئے۔ انہوں نے الاسکا جانے والے فوجی راستے کا ایک حصہ بھی تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ الاسکا میں انہوں نے ریڈیو اسٹیشن اور ہوائی اڈے بنائے۔ وہاں پٹرول کے ذخیرے تلاش کئے۔ اور تیل صاف کرنے والا ایک کارخانہ قائم کیا۔ پھر انہوں نے وہاں چار سو میل لمبی پائپ لائن بچھائی اور پانامہ نہر پر کئی آہنی دروازے قائم کئے۔

کیسر دنیا میں سب سے بڑی سیمنٹ فیکٹری کا مالک ہے۔ اس نے دنیا کے تین بڑے ڈیم بنانے میں نمایاں کردار انجام دیا ہے۔ یعنی کولوریڈو دریا بولڈر ڈیم اور ہیگون میں کولمبیا دریا

پر، بونوویل ڈیم (بہت سے انجینئر اس کام کو ناممکن قرار دے چکے تھے) اور دریائے کولمبیا پر کولی ڈیم جو دنیا کا سب سے بڑا ڈیم ہے۔
جنگ کے دنوں میں ہنری کیسر کے کارخانوں میں سب سے زیادہ مزدور کام کیا کرتے تھے۔

سادہ لوح مزدوروں کا خیال ہے کہ لحیم شحیم، فربہ اندام اور گنجے سر والا آدمی انہیں میں سے ایک ہے اور یہ ہے بھی حقیقت۔ وہ اس لئے اسے پسند کرتے ہیں کہ وہ سادہ طبیعت کا مالک ہے اور کام کرنے سے گھبراتا نہیں۔
جنگ سے پہلے کیسر کے پاس ٹوٹی پھوٹی کشتیاں مرمت کرنے والا کارخانہ بھی نہ تھا۔ لیکن چار برس کے اندر اندر دنیا کے بہترین اور تیز رو بحری جہاز بنانے والے کارخانے کا مالک بن گیا۔

اس نے جہاز بنانے کے نہایت پرانے کاروبار میں انقلاب بپا کر دیا۔ مثلاً اس سے پہلے ایک جہاز مکمل کرنے میں عموماً چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوتا تھا۔ لیکن اوراگون میں کیسر کے ایک کارخانے نے ایک لبرٹی شپ دس دن کے اندر تیار کر دیا۔ جب کیلیفورنیا میں اس کے دوسرے کارخانے کے مزدوروں تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے قسم کھالی کہ وہ اوراگون کے کاریگروں سے سبقت لے جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے اتوار کی صبح کو ایک جہاز بنانا شروع کیا اور جمعرات کی دوپہر تک اسے نوے فی صد مکمل کر دیا۔ ذرا خیال کریں۔ ساڑھے چار دن میں ایک ایسا کام انجام دینا جو پہلے چھ ماہ میں پورا ہوا کرتا تھا۔
لیکن آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ رفتار ہمیشہ کے لئے قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ کیسر ایک ماہ میں ایک جہاز مکمل کر لیا کرتا تھا۔
کیسر کو دباؤ کے تحت کام کرنے سے محبت ہے۔ اسے ایسے کام انجام دینے سے پیار ہے جنہیں ایکسپرٹ ناممکن قرار دیتے ہیں۔ شروع شروع میں جب اس نے جہاز کے مختلف حصے الگ الگ جگہوں پر بنا کر بعد میں انہیں یکجا کرنے کے بارے میں سوچا تو اس زمانے میں ایسے جہازوں کی تعمیر کا بالکل ہی کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے زندگی میں فقط ایک شپ یارڈ دیکھا تھا۔ اس نے پرانی طرز پر جہاز بنانے سے انکار کر دیا۔ یعنی پہلے جہاز کا مستول کھڑا کیا جائے اور پھر اس کے گرد جہاز بنایا جائے۔ جنگ کے لئے یہ طریقہ بہت سست رفتار تھا۔
کیسر نے اپنے انجینئروں سے کہا کہ وہ ایک عام شپ یارڈ سے تین گنا زیادہ بڑا شپ یارڈ تعمیر

KITABISTAN.BLOGSPOT.COM

کریں تاکہ وہاں ہزاروں آدمی بیک وقت کام کر سکیں اور اسی شپ یارڈ میں جہاز کے مختلف حصے تیار ہو سکیں۔

جب یہ تمام حصے مکمل ہو جاتے تو ایک بہت بڑا کرین جو اس سے پہلے کبھی کسی شپ یارڈ میں استعمال نہ ہوا تھا۔ ان حصوں کو اٹھا اٹھا کر جہاز میں ان کی جگہ پر رکھ دیتا۔ جس طرح موٹر کاریں تیار کی جاتی ہیں۔ ہو بہو اسی طرح وہ جہاز تیار کیا کرتا تھا۔

ہنری' جے کیسر جب ایک لڑکا تھا تو اس زمانے میں بھی اس کے اندر وہ دور نظری' وہ ولولہ انگیزی اور وہ سیماب پائی موجود تھی جس نے اسے امیر اور نامور بنایا تھا۔ اس کا جرمن باپ جو جوتے بنانے کا کام کیا کرتا تھا۔ مشکل سے اتنے پیسے کما سکتا تھا جس سے چار بچوں کا پیٹ بھر سکے چونکہ کنبے میں فقط ہنری ہی ایک لڑکا تھا۔ لہٰذا اسے گیارہ برس کی عمر میں سکول چھوڑ کر نوکری کرنی پڑی۔ اسے سٹور میں دن کے وقت پارسل وغیرہ دینے کا کام مل گیا۔ لیکن اس نے اپنی راتیں' اپنے شوقیہ کام فوٹو گرافی کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ پبلک لائبریری سے اسے فوٹو گرافی پر جس قدر کتابیں مل سکیں اس نے پڑھ ڈالیں۔ بعد میں لیک پلیٹ (نیویارک) کے قریب ایک تفریحی قصبے میں اسے ایک فوٹو گرافر کے یہاں ملازمت مل گئی لیکن وہ اسے ملازمت سمجھنے کی بجائے تفریح طبع خیال کرتا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت فوٹو گرافی کا فن سیکھنے پر صرف کر دیتا۔ اس نے پوسٹ کارڈ لیک پلیٹ کی تصویریں بھی بنائیں جو بہت زیادہ تعداد میں فروخت ہوئیں۔ اور ایک سال کے اندر اندر وہ اس سارے کاروبار کا مالک بن گیا۔ لیکن پانچ سال کے عرصے میں اس نے پام بیچ' ڈے ٹونا بیچ اور فلوریڈا میں فوٹو گرافی کی ذاتی دکانیں کھول لیں۔ لیکن آج کیسر کے پاس ایک کیمرہ بھی نہیں۔

البتہ نئی دنیا فتح کرنے کا جذبہ ہے۔ ہنری کیسر فوٹو گرافی کا کاروبار ترک کر کے بحرالکاہل کے شمال مغرب میں چلا گیا جہاں ایک نئی سلطنت بن رہی تھی۔ اسے ہاکے سینڈ اینڈ گریول کمپنی میں ایک سیلزمین کی ملازمت مل گئی۔ اس نے کمپنی کے کچھ حصے بھی خرید لئے اور ان کی قسطوں کی ادائیگی اپنی ہفتہ وار تنخواہ میں سے کرتا۔

ایک دن وہ شکاگو کی ایک ایسی تعمیراتی کمپنی کے پاس گیا جس نے سپوکین کے شہر میں تعمیرات کا ایک بہت بڑا ٹھیکہ لیا تھا۔ وہ پائپ لائن فروخت کرنے کے لئے گیا تھا اپنے اس مقصد میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکا مگر کمپنی والوں نے اسے ملازم ضرور رکھ لیا۔

جب کیسر اٹھائیس برس کا تھا تو اس نے ملازمت چھوڑ کر خود اپنا کاروبار شروع کر دیا۔

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

اس وقت اس کی ساری ملکیت چار گھوڑے اور تعمیراتی مسالہ ملانے والی ایک مشین تھی- یہ چیزیں بھی اس نے کرائے پر لی تھیں- لیکن اس کے پاس ایسی اہم چیزیں تھیں جو بظاہر دکھائی نہیں دیتیں مثلاً بے پناہ قوت' ولولہ انگیزی- تجربہ اور زندگی میں آگے بڑھنے کا جذبہ- دو ماہ کے اندر اندر اس کی گلیاں ہموار کرنے کا کام مکمل کر دیا-

____ ایک ایسا کام جو 50'000 پونڈ کا تھا- اب لکشمی دیوی اس کے سواگت کے لئے آگے بڑھ رہی تھی- چند برس کے اندر اندر اس کی کمپنی نے بحرالکاہل کے ساحل پر ہزاروں میل لمبی سڑکیں بنا دیں-

ہنری کیسر نے بار بار کہا ہے کہ اسے روپے میں کوئی دلچسپی نہیں' یہ ہے بھی صحیح- اس کے پاس روپیہ خرچ کرنے کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا- وہ کبھی کوئی فلم شو دیکھنے نہیں گیا- مطالعہ کے لئے بھی اسے وقت نہیں ملتا- تعطیلات کا تو اسے بالکل خیال نہیں آیا- اسے فقط اپنے کام سے غرض ہے- چوبیس گھنٹوں میں وہ جس قدر زیادہ کام کرتا ہے اتنا ہی زیادہ خوش رہتا ہے- اس نے نیویارک اور واشنگٹن کے ہوٹلوں میں فلیٹ کرائے پر لے رکھے ہیں- وہ ٹیلی فون پر کانفرنس کرنے میں چند گھنٹے صرف کر دیتا ہے- بحراٹلانٹک سے بحرالکاہل تک اس نے ٹیلی فون کا اپنا الگ سلسلہ لگوا رکھا ہے اور اس پر اس کا سالانہ خرچ 40'000 پونڈ کے لگ بھگ ہوتا ہے وہ سرکاری افسروں کو دو دو صفحات پر مشتمل تاریں بھیجتا ہے اور ان سے کسی نہ کسی چیز کا مطالبہ کرتا رہتا ہے- وہ رات کو پانچ گھنٹوں سے زیادہ نہیں سوتا یہ آدمی اتنے بڑے ہنگامے میں کس طرح زندہ ہے- یہ ایک سربستہ راز ہے-

کیسر نے اپنی موسم گرما کی رہائش گاہ نیو اڈا پہاڑوں میں سطح بحر سے 6500 فٹ بلندی پر جھیل تاہو پر بنا رکھی ہے- جس طرح اس نے یہ عمارت تعمیر کی ہے وہ اس کے کام کرنے کے انداز کی ترجمانی ہے- اس نے جھیل تاہو پر بلڈوزر اور کرین وغیرہ نہایت چابکدستی سے پہنچائے اور جنگل کا سینہ چیر کر راستے کی تمام ولدلیں بھر دیں- یہ سب کچھ اس نے مزدوروں کی ایک فوج کی مدد سے کیا جو رات کے وقت بھی بلبوں کی روشنی میں کام کرتے رہتے تھے- یہ وسیع اور بلند عمارت اس نے اسی (80) دن میں مکمل کر دی- اور اس برق رفتاری سے کی جیسے تہذیب کا مستقبل ہوا میں معلق ہو-

لوگ سوچتے تھے کہ امن کے دنوں میں جب اسے ہر طرف سے دوسری کمپنیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا- کیا وہ اپنا یہ وسیع و عریض کاروبار قائم رکھ سکے گا؟ بعض کا جواب مثبت

میں اور بعض کالونی میں تھا۔ اس نے ایک ڈویلپمنٹ اور انجینئرنگ ڈویژن قائم کر رکھا تھا۔ جس میں انجینئر، سائنس دان، موجد اور محقق کام کرتے ہیں۔ جو نئی چیزوں اور نئی صنعتوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔

کیسر کا کہنا ہے کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک نئے مواد سے تیز رو مسافر جہاز بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ان جہازوں پر زیادہ خرچ نہ اٹھے گا۔ اور ہزاروں لوگ کم کرائے پر سفر کر سکیں گے۔

جہاں تک موٹر کاروں کا تعلق ہے۔ ہنری کیسر ان سے بے حد بیزار ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تین ہزار پونڈ کی کار فقط ڈیڑھ سو پونڈ کا آدمی اٹھا سکے۔ اس نے ہلکی پھلکی دھات سے ایک ایسی موٹر کار بنانے کی دھمکی دی ہے جس کا وزن موجودہ کاروں سے ایک تہائی ہو گا اور جن میں ہوائی جہازوں کا پٹرول استعمال کیا جائے گا۔

وہ ایسے ہوائی جہاز بنانے کا ارادہ رکھتا ہے جو اس قدر محفوظ ہوں گے کہ ہماری دادی انہیں چلا اور خرید سکیں گی۔

ہنری جے کیسر بہت بڑا رجائی ہے۔ اس کا کہنا ہے۔

"آپ ترقی کو کسی بوتل میں بند کر کے اس کے ڈھکنے پر بیٹھ نہیں سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو بھک سے اڑ جائیں گے۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

رائٹ برادران

انہوں نے بارہ سیکنڈ میں تاریخ کا رخ بدل دیا۔

کیا آپ کا کوئی بیٹا ہے؟ اگر ہے تو کیا آپ کو کبھی یہ احساس ہوا ہے کہ آپ کا دیا ہوا کوئی کھلونا یا کتاب اس کی زندگی بدل سکتی ہے؟ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ 1878ء میں ایک پادری جو کسی مذہبی کام کے سبب سفر کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دو لڑکوں کے لئے ایک مشینی کھلونا خرید لیا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اس کے لڑکے اسے ملنے کی خاطر بھاگے۔ لڑکوں کو دیکھ کر اس نے کہا۔ "بیٹو! میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں لو اسے کیچ کرو۔" اور اس نے ایک چیز ان کی طرف پھینک دی۔ مگر اس چیز نے لڑکوں کی سمت میں جانے کی بجائے ایک ناقابل یقین بات کی۔ وہ چھت کی سمت اڑنے لگی اور چند لمحے پھڑ پھڑا کر فرش پر گر پڑی۔ لڑکے حیرت سے پھٹی آنکھوں سے اسے پکڑنے کے لئے بھاگے۔

وہ ایک اڑنے والا مشینی کھلونا تھا جو تار، بانس اور کاغذ کا بنا ہوا تھا۔ اس کھلونے نے ان لڑکوں میں پرواز کرنے کا ایک ایسا شوق پیدا کر دیا جو ایک ایسی اڑن مشین کی ایجاد کا سبب بنا جس نے ہم سب کی زندگیوں پر گہرا اثر کیا ہے۔ ہزاروں برس پہلے بارود کی ایجاد کے سوا کسی دوسری ایجاد نے انسانی معاشرت کو اس قدر تبدیل نہیں کیا۔

ان لڑکوں کا نام ولبر رائٹ اور آلور رائٹ تھا۔

وہ لڑکے اس اڑن کھلونے سے اتنی دیر تک کھیلتے رہے جب تک کہ وہ ٹوٹ نہ گیا۔ چونکہ ان کے پاس دوسرا کھلونا خریدنے کے لئے پیسے نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے خود ہی اس قسم کا کھلونا بنا لیا۔ بعد میں انہوں نے پتنگیں بنانی شروع کر دیں۔ جو اس قدر عمدہ ہوتیں کہ سارے محلے کے لڑکے انہیں سے خریدتے۔

اس وقت سے رائٹ برادران کے دل میں اڑنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی۔ وہ گھنٹوں پشت کے بل سیدھے لیٹے اپنی پتنگوں کو اڑتے دیکھتے تھے۔ وہ چڑیوں اور کبوتروں کو اڑتا دیکھتے رہتے اور یہ بھی دیکھتے کہ کس طرح عقاب ہوا کی لہروں پر بغیر بازو ہلائے اڑتا رہتا ہے۔

فکشن ہاؤس کی شاہکار کتابیں

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے	ڈیل کارنیگی
میٹھے بول میں جادو ہے	ڈیل کارنیگی
گفتگو اور تقریر کا فن	ڈیل کارنیگی
39 بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی
مانیں نہ مانیں	ڈیل کارنیگی
کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں	ڈیل کارنیگی
ابراہام لنکن (سوانح عمری)	ڈیل کارنیگی
کلیات ڈیل کارنیگی	مرتب: اسلم کھوکھر
کلیات خلیل جبران	مرتب: ملک اشفاق
خلیل جبران کے شاہکار افسانے	مرتب: ملک اشفاق
ٹیگور کے شاہکار افسانے	مرتب: اسلم کھوکھر
تلاش حق	مہاتما گاندھی
خانہ بدوش	اجیت کور
مشرق کی بیٹی	بے نظیر بھٹو
تزک ہٹلری	ایڈولف ہٹلر
داستان مسولینی	بینٹو مسولینی
داستان نپولین	ا۔ میلی لڈوگ
ذوالفقار علی بھٹو ولادت سے شہادت تک	سجاد بخاری
تاریخ ٹیپو سلطان	سید میر علی کرمانی

فِکشن ھاؤس

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM